رَبِّ اِنِّیۡ لِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ اِلَیَّ مِنۡ خَیۡرٍ فَقِیۡرٌ

اے میرے ربّ! یقیناً میں ہر اچھی چیز کے لئے، جو تُو میری طرف نازل کرے، ایک فقیر ہوں۔

ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

آبگینے

خواتین کا علمی، ادبی معاشرتی و مذہبی
سرگرمیوں کا عالمی مجلّہ

مُدِیرَہ

مدثرہ عباسی

انچارج گوشۂ ادب	انچارج بچوں کا گلستان / پکوان
حمیرا نگہت	عیشۃ الراضیہ عباسی

زیر انتظام عباسی اکیڈمی

سرپرست اعلیٰ و مدیر اعلیٰ محی الدین عباسی

شمارہ نومبر 2021
جلد 3 شمارہ 3
ربیع الاوّل / ربیع الثانی

خدا تعالیٰ کے فضل و رحم کے ساتھ
ھُــــــوَ الناصر

ایک دل شیشہ کی مانند ہوا کرتا ہے ٹھیس لگ جائے ذرا سی تو صدا کرتا ہے

آبگینے

ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ

خواتین کا علمی، ادبی، معاشرتی و مذہبی سرگرمیوں کا عالمی مجلّہ
جلد 3 شمارہ 3 - نومبر 2021 - ربیع الاوّل / ربیع الثانی

مدیرہ
مدثرہ عباسی

انچارج گوشۂ ادب
حمیرا نگہت

انچارج بچوں کا گلستان / پکوان
عیشۃ الراضیہ عباسی

اپنی تمام تحریریں اور قیمتی آراء درج ذیل ای میل پر بھجوائیں

aabgeene6@gmail.com
m.abbasi.uk@gmail.com
www.aabgeenei.com

لندن سے جاری ہونے والا

ماہنامہ آبگینے آپ کا اپنا رسالہ ہے اسکی اشاعت و ترویج میں بھرپور حصہ ڈالیئے

فہرست مضامین

درس قرآن کریم	3
اداریہ	4
ازواج النبی کے حجرات	6
حضرت زینب رضی اللہ عنہ	7
مجھے آج بھی آزادی کی تلاش ہے	10
کامیاب عورت اور ناکام ازدواجی زندگی	12
زرتشتی مذہب کے بارے میں چند اہم اور بنیادی معلومات	14
مردوں کو قابو میں رکھنے کے رہنما اصول	16
جوان پاکستان کو بنائے قوت کا نشاں	17
کشمیر میں باغات کم چھاؤنیاں زیادہ	18
اپنے بزرگوں کی آخری سانس تک قدر کیجیے	19
پتریاٹہ: جہاں فطری حسن میلا ہو رہا ہے!	21
کون کس کو مارتا ہے	24
کاش مرنے سے پہلے ایک بار اپنا گھر دیکھ سکوں	26
اردو افسانہ ایک معصوم خواہش	27
گلگت میں خاتون صحافی	29
قلیوپیٹرا زلیخا-لگا ہے مصر کا بازار دیکھو	31
راجہ گدھ کا فکری پہلو	33
سات بچوں کی پیدائش	35
یاسمین لاری	37
یہ نیلا آسمان کیا ہے؟	38
حوریم سلطان سے قسم سلطان تک قسط اول	40
اکثر لوگ مکڑیوں کو ہلاک کرنے والوں کو برا کیوں سمجھتے	43
کینیڈا میں بچوں کی اجتماعی قبروں کے ملنے کے پیچھے چھپی ہولناک تاریخ	47
بچوں میں حس مزاح ان کی ذہانت کا اظہار ہے	48
آئی برو تھریڈنگ	49
شعر و شاعری	13-15-36

زیر انتظام عباسی اکیڈیمی
سرپرست اعلیٰ و مدیر اعلیٰ محی الدین عباسی

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۔ وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ۔ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۔ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا (سورۃ الاحزاب آیت 31 تا 34)

ترجمہ:

اے نبی کی بیویو! جو بھی تم میں سے کھلی فاحشہ کا ارتکاب کرے گی اس کے لئے عذاب کو دوگنا بڑھا دیا جائے گا اور یہ بات اللہ پر آسان ہے۔ اور تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گی اور نیک اعمال بجالائے گی ہم اسے اس کا اجر دو مرتبہ دیں گے اور اس کے لئے ہم نے بہت عزت والا رزق تیار کیا ہے۔
اے نبی کی بیویو! تم ہرگز عام عورتوں جیسی نہیں ہو بشرطیکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔ پس بات لجا کر نہ کیا کرو ورنہ وہ شخص جس کے دل میں مرض ہے طمع کرنے لگے گا۔ اور اچھی بات کہا کرو۔ اور اپنے گھروں میں ہی رہا کرو اور گزری ہوئی جاہلیت کے سنگھار جیسے سنگھار کی نمائش نہ کیا کرو اور نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اے اہلِ بیت! یقیناً اللہ چاہتا ہے کہ تم سے ہر قسم کی آلائش دور کر دے اور تمہیں اچھی طرح پاک کر دے۔

تفسیر:

فَاحِشَةٌ: ناشائستہ حرکت۔ اور اس بُرے کام کو کہتے ہیں جس کی بُرائی نظر آ جائے۔ چونکہ نبی کی بیویوں کو اعلیٰ نیکیوں کی تعلیم دی گئی ہے اس لئے اگر ان سے کوئی ایسا کام ظاہر ہو جو اعلیٰ نیکی نہیں گو عام نیکی ہے تب بھی وہ محاورہ میں فَاحِشَةٌ کہلائے گا۔

وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا: اس میں معرفت کا نکتہ ہے کہ جو بی بی فرماں بردار ہو گی۔ اسے رزقِ کریم دیا جائے گا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کو اس رزق سے بہرۂ وافی ملا۔ جس سے ثابت ہوا کہ وہ بہت فرماں بردار تھیں۔

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ: حضرت عاشہؓ کھل کر بات کہہ دیتی تھیں۔ یہ اس ارشاد کی تعمیل ہے۔

لَا تَخْضَعْنَ: دبی زبان سے مت کہو۔

وَلَا تَبَرَّجْنَ: حضرت عائشہؓ کو ایک جنگ بھی پیش آئی مگر اس میں جاہلیت الاولیٰ کی صورت نہیں۔

لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بی بی ماریہؓ پہلے عیسائی تھیں اور صفیہؓ یہودی۔ اس قسم کے عقیدوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں پاک ہوئیں۔

وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ: جاہلوں کی طرح اکھاڑوں میں نہ نکلو۔

وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ: عورتوں کو لازم ہے کہ اپنے مال میں سے علیحدہ خود زکوٰۃ دیں۔

اَهْلَ الْبَيْتِ: تین دفعہ قرآن میں یہ لفظ آیا ہے۔ تینوں جگہ بیبیاں ہیں۔ شیعہ پر حجّت ہے جو بیبیوں کو اس میں گنتے نہیں۔

(حقائق الفرقان جلد سوم صفحہ 409-408)

❁❁❁

ادارتی پالیسی

آبگینے خواتین ڈائجسٹ کی ادارتی پالیسی واضح ہے مذہبی اور غیر مذہبی نقطۂ نظر پر اور اظہار آزادی پر کوئی پابندی نہیں۔ یہ سیاسی، مذہبی، لسانی، علاقائی، تعصب اور عصبیت سے پاک ہے۔ اس کا کسی طبقہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم تمام مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والوں کو خوش دلی سے خوش آمدید کہتے ہیں۔ آیئے اپنا مؤقف بلا خوف و خطر بیان کیجیے۔ لیکن دوسروں کے جذبات کا احترام آپ کا اور ہمارا اخلاقی فرض ہے۔ اپنا مضمون یا منظوم کلام ہمیں بھیجنے سے قبل اس کو اچھی طرح سے پڑھ لیں تاکہ کمپوزنگ (ٹائپ) کی غلطیاں آپ خود نکال سکیں۔ تحریر میں غلطیاں کم ہونے کی صورت میں جلد قابل اشاعت ہو گی۔ یاد رہے متن میں تبدیلی کرنا ایڈیٹر کا اختیار ہوتا ہے ضروری امر یہ ہے کہ مضمون یا کلام وہی قابل اشاعت ہو گا جو پہلے کسی اخبار یا انٹرنیٹ سوشل میڈیا پر شائع نہ ہوا ہو۔ علاوہ ازیں آپکی تحریر ایک ہزار الفاظ سے زیادہ نہ ہو بعض صورتوں میں استثناء دیا جا سکتا ہے۔
اُمید ہے کہ آپ ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں گے۔ جزاکم اللہ

مدثرہ عباسی
مدیرہ

مدثرہ عباسی

مدیرہ

اداریہ

عورتوں سے حسن سلوک

عورتوں سے حسنِ سلوک کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاص خیال رکھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے دنیا میں عورت کے ورثہ کے حق کو قائم کیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں لڑکوں اور لڑکیوں کو باپ اور ماں کے ورثہ کا حقدار قرار دیا گیا۔ اسی طرح ماؤں اور بیویوں کو بیٹیوں اور خاوندوں کے ورثہ میں حقدار قرار دیا گیا۔ اور بعض صورتوں میں بہنوں کو بھی بھائیوں کے ورثہ کا حقدار قرار دیا گیا۔ اسلام سے پہلے دنیا کے کسی مذہب نے بھی اس طرح حقوق قائم نہیں کیے! اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو اس کے مال کا مستقل مالک قرار دیا ہے خاوند کو حق نہیں کہ خاوند ہونے کی وجہ سے عورت کے مال میں دست اندازی کر سکے۔ عورت اپنے مال کے خرچ کرنے میں پوری مختار ہے۔

عورتوں سے حسن سلوک میں آپ ایسے بڑھے ہوئے تھے کہ عرب کے لوگ جو اس بات کے عادی نہ تھے ان کو یہ بات دیکھ کر ٹھوکر لگتی تھی۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میری بیوی بعض دفعہ میری باتوں میں دخل دیتی تو میں اس کو ڈانٹا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ عرب کے لوگوں نے کبھی عورتوں کا یہ حق تسلیم نہیں کیا کہ وہ مردوں کو ان کے کاموں میں مشورہ دیں۔ اس پر میری بیوی کہا کرتی تھیں کہ جاؤ جاؤ، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ان کو مشورہ دیتی ہیں اور آپ ان کو کبھی نہیں روکتے تو تم ایسا کیوں کہتے ہو، اس پر میں اسے کہا کرتا تھا کہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت لاڈلی ہے اس کا ذکر نہ کرو، باقی رہی تمہاری بیٹی سو اگر وہ ایسا کرتی ہے تو اپنی گستاخی کی سزا کسی دن پائے گی۔ ایک دفعہ جب کسی بات سے ناراض ہو کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کر لیا کہ کچھ دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر رہیں گے اور بیویوں کے پاس نہیں جائیں گے اور مجھے اس کی خبر ملی، تو میں نے کہا دیکھو جو میں کہتا تھا وہی ہو گیا۔ میں اپنی بیٹی حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں گیا تو وہ رو رہی تھیں۔ میں نے کہا حفصہ رضی اللہ عنہا کیا ہوا، کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں طلاق دے دی ہے۔ انہوں نے کہا یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بات کی وجہ سے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ کچھ عرصہ کے لئے گھر میں نہیں آئیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، میں نے کہا حفصہ رضی اللہ عنہا میں تجھے پہلے نہیں سمجھایا کرتا تھا کہ تو عائشہ رضی اللہ عنہا کی نقلیں کرتی ہے، حالانکہ عائشہ رضی اللہ عنہا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص طور پر پیاری ہے۔ دیکھ آخر تو نے وہی مصیبت سہیڑ لی جس کا مجھے خوف تھا یہ کہہ کر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک کھردری چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم پر کرتا نہ تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ اور کمر پر چٹائی کے داغ لگے ہوئے تھے میں آپ کے پاس بیٹھ گیا اور کہا یا رسول اللہ یہ قیصر و کسریٰ کہاں مستحق ہیں اس بات کے کہ ان کو خدا تعالیٰ کی نعمتیں ملیں مگر وہ تو کس آرام سے زندگی بسر کر رہے ہیں اور خدا کے رسول کو یہ تکلیف ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عمرؓ یہ درست نہیں اس قسم کی زندگیاں خدا کے رسولوں کو نہیں ہوتیں یہ دنیادار بادشاہوں کا شغل ہے۔ پھر میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سارا وہ واقعہ سنایا جو میری بیوی اور بیٹی کے ساتھ گزرا تھا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میری باتیں سن کر ہنس پڑے اور فرمایا عمرؓ یہ بات درست نہیں کہ میں نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ میں نے تو صرف ایک مصلحت کی خاطر کچھ دنوں کے لیے اپنے گھر سے باہر رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔

(بخاری کتاب النکاح باب موعظۃ الرجل ابنتہ لحال زوجھا)

عورتوں کے جذبات کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا خیال تھا کہ ایک دفعہ نماز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بچہ کے رونے کی آواز آئی تو آپ نے نماز جلدی جلدی پڑھا کر ختم کر دی پھر فرمایا ایک بچہ کے رونے کی آواز آئی تھی، میں نے کہا اس کی ماں کو کتنی تکلیف ہو رہی ہو گی۔ چنانچہ میں نے نماز جلدی ختم کر دی تا کہ ماں اپنے بچہ کی خبر گیری کر سکے۔

(بخاری کتاب الصلوٰۃ بعض من اخف الصلوٰۃ عند بکاء الصبی)

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے سفر پر جاتے جس میں عورتیں بھی ساتھ ہوتیں تو ہمیشہ آہستگی سے چلنے کا حکم دیتے۔ ایک دفعہ ایسے ہی موقع پر جب کہ سپاہیوں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں اور اونٹوں کی نکیلیں اٹھا لیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ رفقاً بالقواریر ارے کیا کرتے ہو عورتیں بھی ساتھ ہیں اگر تم اس

طرح اونٹ دوڑاؤ گے تو شیشے چکنا چور ہو جائیں گے۔

(بخاری کتاب الادب)

ایک دفعہ جنگ کے میدان سے کسی گڑبڑ کی وجہ سے سواریاں بدک گئیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی گھوڑے سے گر گئے اور بعض مستورات بھی گر گئیں۔ ایک صحابی جن کا اونٹ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گرتے ہوئے دیکھ کر بے تاب ہو گئے اور کود کر یہ کہتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دوڑے ''یا رسول اللہ میں مرجاؤں اور آپ بچے رہیں''۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں رکاب میں اُلجھے ہوئے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جلدی جلدی اپنے آپ کو آزاد کیا اور اس صحابی کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا ''مجھے چھوڑو اور عورتوں کی طرف جاؤ'' جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت سب مسلمانوں کو جمع کر کے جو وصیتیں کیں ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ میں تم کو اپنی آخری وصیت یہ کرتا ہوں کہ عورتوں سے ہمیشہ حسن سلوک کرتے رہنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر فرمایا کرتے تھے جس کے گھر میں لڑکیاں ہوں اور وہ ان کو تعلیم دلائے اور ان کی اچھی تربیت کرے۔ خدا تعالیٰ قیامت کے دن اس پر دوزخ حرام کر دے گا۔

(ترمذی جلد ۲ ابواب البرّ و الصلۃ باب ماجاء فی النفقۃ علی البنات)

عربوں میں رواج تھا کہ اگر عورتوں سے کوئی غلطی ہو جاتی تو انہیں مار پیٹ لیا کرتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ملی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عورتیں خدا کی لونڈیاں ہیں تمہاری لونڈیاں نہیں۔ ان کو مت مارا کرو۔ مگر عورتوں کی چونکہ ابھی تک پوری تربیت نہیں ہوئی تھی، انہوں نے اس دلیل میں آ کر مردوں کا مقابلہ شروع کر دیا اور گھروں میں فساد ہونے لگا۔ آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں عورتوں کو مارنے سے روک دیا ہے اور وہ بڑی بڑی دلیریاں کرتی ہیں۔ ایسی صورت میں تو ہمیں اجازت ملنی چاہیے کہ ہم انہیں مار پیٹ لیا کریں۔ چونکہ ابھی تک عورتوں کے متعلق تفصیل سے احکام نہیں نازل ہوئے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ اگر کوئی عورت حد سے بڑھتی ہے، تو تم اپنے رواج کے مطابق اسے مار لیا کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے اس کے کہ کسی اشد استثنائی صورت میں مرد اپنی عورتوں کو سزا دیتے، انہوں نے وہی پرانا عربی طریق جاری کر لیا۔ عورتوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے پاس آ کر شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا، جو لوگ اپنی عورتوں سے اچھا سلوک نہیں کرتے یا انہیں مارتے ہیں۔ میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ وہ خدا کی نظر میں اچھے نہیں سمجھے جاتے۔ اس کے بعد عورتوں کے حقوق قائم ہوئے اور عورت نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہربانی سے پہلی دفعہ آزادی سے سانس لیا۔

(ابوداؤد کتاب النکاح)

معاویہ بن ہندہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔ یا رسول اللہ بیوی کا حق ہم پر کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو خدا تمہیں کھانے کے لئے دے وہ اسے کھلاؤ۔ اور جو خدا تمہیں پہننے کے لئے دے وہ اسے پہناؤ۔ اور اس کو تھپڑ نہ مارو اور گالیاں نہ دو اور اسے گھر سے نہ نکالو۔

(ابوداؤد)

آپ کو عورتوں کے جذبات کا اسقدر احساس تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ نصیحت فرماتے تھے کہ جو لوگ باہر سفر کے لیے جاتے ہیں انہیں جلدی گھر واپس آنا چاہیے تاکہ ان کے بال بچوں کو تکلیف نہ ہو۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب کوئی شخص اپنی ضرورتوں کو پورا کر لے جس کے لیے اسے سفر کرنا پڑا تھا تو اسے چاہیے اپنے رشتہ داروں کا خیال کر کے جلدی واپس آئے۔

(بخاری و مسلم)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا طریق یہ تھا۔ کہ جب سفر سے واپس آتے تھے تو دن کے وقت شہر میں داخل ہوتے تھے۔ اگر رات آ جاتی تھی، تو شہر کے باہر ہی ڈیرہ ڈال دیتے تھے اور صبح کے وقت شہر میں داخل ہوتے تھے اور ہمیشہ اپنے اصحابؓ کو منع فرماتے تھے کہ اس طرح اچانک گھر میں آ کر اپنے اہل و عیال کو تنگ نہیں کرنا چاہیے۔

(بخاری و مسلم)

اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدِنظر یہ حکمت تھی کہ عورت اور مرد کے تعلقات جذباتی ہوتے ہیں مرد کی غیر حاضری میں اگر عورت نے اپنے لباس اور جسم کی صفائی کا پورا خیال نہ رکھا ہو اور خاوند اچانک گھر میں آپ داخل ہو تو ڈر ہوتا ہے کہ وہ محبت کے جذبات جو عورت کے درمیان ہوتے ہیں ان کو کوئی ٹھیس نہ لگ جائے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمادی کہ انسان جب بھی سفر سے واپس آئے۔ دن کے وقت گھر میں داخل ہو۔ اور بیوی بچوں کو پہلے خبر دے کر داخل ہو تاکہ وہ اس کے استقبال کے لیے پوری طرح تیاری کر لیں۔

❋❋❋

ازواج النبی ﷺ کے حجرات

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد اس سے متصل ازواج مطہرات کیلئے مکان بنوائے۔ اس وقت تک صرف حضرت سودہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں تھیں۔جن کے لئے دو حجرے بنوائے گئے۔

اس کے بعد دیگر ازواج کے عقد میں آنے پر اور مکان بھی بنتے گئے۔ جو کچی اینٹوں اور کھجور کی شاخوں کے تھے۔مسجد نبوی سے ملحق قبلہ رخ بائیں ہاتھ پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مکان تھا اور ان کے ساتھ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کا۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ امام کے مقام کے ساتھ سامنے کی جانب تھا، یہ وہی حجرہ ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیماری کے آخری ایام گزارے ،اس دوران ایک دفعہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بستر سے جھانک کر صحابہ رضی اللہ عنہا کو نماز میں مشغول پایا تو بہت خوش ہوئے۔ اسی حجرہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اور پھر یہیں تدفین ہوئی۔

باقی حجرات کے متعلق یہ بات بھی یقینی ہے کہ وہ ان دو حجروں (حجرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حجرہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا) کے مقابل پر شامی جانب تھے۔ ان میں بالترتیب حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا، حضرت زینب رضی اللہ عنہا بنت خزیمہ، حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا، حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا ،حضرت زینب رضی اللہ عنہا بنت جحش کے گھر تھے۔ان گھروں کے درمیان جو دروازہ مسجد نبوی میں کھلتا تھا وہ باب النساء سے موسوم تھا۔

ازواجِ مطہرات کے یہ سادہ مکانات چھ چھ ،سات سات ہاتھ چوڑے اور دس دس ہاتھ لمبے تھے۔چھت اتنی اونچی تھی کہ آدمی کھڑا ہو تو چھت کو چھو سکتا تھا۔ دروازوں پر پردہ ہوتا تھا۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا گھر وہ تھا جس میں ایلاء کا واقعہ پیش آیا، اس موقع پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہینہ بالاخانہ میں گزارا، اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ گھر دو منزلہ تھا۔ اسی طرح بعض دیگر ازواج کے گھروں میں بھی بالاخانہ کا بھی ذکر ملتا ہے جو شاید آخری سالوں میں تیار کئے گئے تھے۔ واللہ اعلم

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا مکان بھی حجروں سے الگ تھا۔ جسے ان کے عزیز و اقارب نے معاویہ بن ابوسفیان سے خرید کر دیا تھا۔حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا قبطیہ کا مکان مدینہ کے مضافات میں بنی نضیر کے ایک باغ میں تھا جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تحفةً عطا فرمایا تھا۔ جو آج بھی مشربہ امّ ابراہیم رضی اللہ عنہا کے نام سے معروف ہے۔

(طبقات الکبریٰ جلد 8 ص 164۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم از علامہ شبلی نعمانی ص 178)

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَعَلیٰ اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِک وَسَلِّم اِنَّک حَمِیدٌ مَجِیدٌ

(بحوالہ اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم از حافظ مظفر احمد صاحب)

❁❁❁

ضروری اعلان

ادارہ کے مالی حالات کے پیش نظر اور اس کو جاری رکھنے اور مزید ترقی دینے کی خاطر "ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل" اور خواتین ڈائجسٹ "آبگینے" ،لاہور رسالہ دو زبانوں اردو اور انگریزی میں لندن سے شائع ہوتے ہیں۔ ان تینوں رسالوں کو ادارہ اپنی ذاتی مالی حیثیت کے مطابق کئی سالوں سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ دنیا کے تمام قارئین کیلئے یہ معیاری اور پسندیدہ رسالے ہیں۔ ان کا خاص مقصد معاشرے کی بہتر اصلاح، سچی کھری صحافت اور اسلام کی ترقی کے لئے یہ ایک تبلیغی کوشش ہے۔
یاد رہے ایسے اخبارات اور رسائل کو جاری رکھنے کے لیے ایک بڑا ادارہ یا بزنس مین یا اشتہارات کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمیں میسر نہیں۔
آپ تمام سے عاجزانہ درخواست ہے کہ اس کی ماہانہ مالی مدد فرما کر اس کار خیر میں اپنا حصہ ڈالئے۔ آپ کی یہ معمولی رقم ہماری ہمت افزائی اور ترقی کا باعث ہوگی۔ آپ اپنی رقم درج ذیل بینک میں جمع کروا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ آمین

Bank Name:
Lloyds Bank PLC
Account Name:
Lahore International LTD
Account Number:
42534160
Sort Code:
30-96-26
IBAN:
GB89 LOYD 3096 2642 5341 60

حضرت زینب رضی اللہ عنہا

فضائل

آنحضرت ﷺ نے حضرت زینبؓ کے متعلق فرمایا" یہ میری بیٹیوں میں سے سب سے افضل ہے۔کیونکہ اس کو میری وجہ سے تکلیفیں پہنچی ہیں۔" آپؓ کی وفات بھی راہ مولیٰ میں تکالیف کی وجہ سے ہوئی،اور رسول اللہ ﷺ نے انہیں شہیدہ کا لقب عطا فرمایا۔ حضور ﷺ نے فرمایا "میں نے زینبؓ کی کمزوری کو یاد کر کے اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ! اس کی قبر کی تنگی اور غم کو ہلکا کر دے۔" آپؓ کی تدفین کے وقت آنحضور ﷺ نے حضرت زینبؓ کو مخاطب کر کے فرمایا"ہمارے آگے بھیجے ہوئے بہترین انسان عثمانؓ بن مظعون کے ساتھ جنّت میں جا کر اکٹھے ہو جاؤ۔"

پیدائش،قبول اسلام اور شادی

حضرت زینبؓ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سب صاحبزادیوں میں بڑی تھیں جو بعثت نبوی سے دس سال قبل مکّہ میں پیدا ہوئیں۔جبکہ حضور ﷺ کی عمر 30 سال تھی۔جب حضور ﷺ کو نبوت عطا ہوئی تو حضرت زینبؓ نے اپنی والدہ حضرت خدیجہؓ اور بہنوں کے ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ کی تصدیق اور قبول اسلام کی سعادت پائی۔حضرت خدیجہؓ کی تجویز پر صاحبزادی حضرت زینبؓ کی شادی تقریباً10 سال کی عمر میں ہی اپنے خالہ زاد بھائی ابو العاص بن ربیع کے ساتھ ہوئی جو حضرت خدیجہؓ کی حقیقی بہن ہالہ کے بیٹے تھے۔

آنحضور ﷺ نے دعویٰ نبوت فرمایا تو قریش کی مخالفت اور ان کے ڈرانے دھمکانے پر حضور ﷺ کی دو صاحبزادیوں حضرت ام کلثومؓ اور حضرت رقیہؓ کو توانکے خاوندوں نے نکاح کے بعد رخصتی سے قبل ہی طلاق دیدی لیکن ابو العاص نے جرأت و دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وفا کا دامن نہ چھوڑا اور حضورؐ کی بیٹی زینبؓ کو طلاق دینے سے انکار کر دیا۔ قریش نے ابو العاص کو لالچ دی کہ آپ اگر محمد ﷺ کی بیٹی کو چھوڑ دیں تو جو لڑکی پسند کرو گے ہم اس سے تمہاری شادی کر دیں گے۔لیکن اس کے باوجود نیک دل، جرأت مند اور وفا شعار ابو العاص نے زینبؓ کو طلاق دینے سے انکار کر دیا۔

حضرت زینبؓ کی ہجرت مدینہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ کے بعد تمام قبائل عرب آپؐ کے دشمن بن چکے تھے۔حضرت امّ کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ کو حضور ﷺ نے اپنے پاس لانے کیلئے مدینہ سے حضرت زیدؓ بن حارثہ کی سرکردگی میں چند افراد کو مکّہ بھجوایا جو حکمت عملی کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی دونوں صاحبزادیوں کو مدینہ لائے۔لیکن حضرت زینبؓ اپنے خاوند ابو العاص کے پاس تھیں اور بچپن سے دینِ اسلام پر قائم تھیں۔شادی کے بعد ایک طرف حضرت زینبؓ پر اپنے شوہر کی ذمہ داری بھی تھی دوسری طرف وہ اپنی حقیقی خالہ کے گھر بیاہی ہوئی تھیں جہاں بظاہر ان کے لئے کوئی خوف نہ تھا۔مگر رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے بعد مکہ میں ان کا مسلسل دشمنانِ اسلام کے نرغے میں رہنا اب خطرہ سے خالی بھی نہ رہا تھا۔ان کے شوہر ابو العاص ابھی اپنے دین پر تھے،جب حضرت زینبؓ کی جان اور ایمان کی سلامتی کیلئے ہجرت ناگزیر ہوگئی تو پہلی دفعہ ناکامی کے بعد دوسری مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد اور حکمت عملی سے یہ پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

اس پہلی ہجرت کا واقعہ حضرت عائشہؓ یوں بیان کرتی ہیں کہ حضور ﷺ جب مدینہ تشریف لے گئے تو آپؐ کی بیٹی حضرت زینبؓ قبیلہ کنانہ کے بعض لوگوں کے ساتھ یا ایک اور روایت کے مطابق ابو العاص کے چھوٹے بھائی کنانہ کے ساتھ سفر پر روانہ ہوئیں۔مگر یہ تدبیر کارگر نہ ہو سکی اور مخالفین کو پتہ چل گیا وہ تعاقب میں نکلے اور ہبار بن اسود حضرت زینبؓ کے قریب پہنچ کر تیر چلانے لگا۔یہاں تک کہ حضرت زینبؓ کو اونٹ سے گرا دیا اور ان کا حمل ضائع ہو گیا اور خون بہنے لگا۔کنانہ نے ترکش سے تیر نکالے اور کہا کہ اب اگر کوئی قریب آیا تو ان تیروں کا نشانہ ہو گا۔لوگ ایک طرف ہو گئے تو ابو سفیان سردارانِ قریش کے ساتھ آیا اور کہا کہ تیر روک لو ہم کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔کنانہ نے تیر ترکش میں ڈال لئے۔ابو سفیان نے کہا محمد ﷺ کے ترکِ وطن سے حالات جہاں تک جا پہنچے ہیں تم کو معلوم ہیں اب اگر تم اعلانیہ ان کی لڑکی کو ہمارے قبضہ سے نکال کر لے گئے تو لوگ کہیں گے کہ ہماری کمزوری ہے۔بہتر ہو گا کہ ابھی ہمارے ساتھ واپس مکہ چلو پھر کسی وقت رات کو چھپ کر خاموشی سے نکل جانا۔چنانچہ آپؓ مکّہ واپس تشریف لے آئیں اور پھر کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد جب معاملہ ٹھنڈا پڑ جانے تک ہجرت کا ارادہ موقوف کیا۔اس واقعہ پر آپؓ کے میکے بنو ہاشم اور آپؓ کے سُسرال بنو امیہ جھگڑ پڑے۔بنو امیہ نے کہا ہم اسکے زیادہ قریبی ہیں اس لئے حضرت زینبؓ کو مکہ میں ہی رہنا چاہئے۔چنانچہ وہ اپنے شوہر کے گھر رہیں یہاں تک کہ غزوۂ بدر پیش آ گیا۔

حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ جنگ بدر کے بعد جب اہل مکّہ نے اپنے قیدیوں کا فدیہ بھیجا تو حضرت زینبؓ نے (جو ابھی مکہ میں ہی تھیں) ابو العاص کی آزادی کے لئے فدیہ کے مال میں حضرت خدیجہؓ کا وہ ہار بھی بھجوایا جو انہوں نے شادی کے وقت حضرت زینبؓ کو پہنا کر ابو العاص کے گھر رخصت کیا تھا۔حضورؐ نے وہ ہار دیکھا جو ایک ماں کی بیٹی کیلئے نشانی تھی،اور جو ایک مجبور مومنہ کو حالتِ کسمپرسی میں بھجوانی پڑی تھی تو آپؐ پر سخت رقّت طاری ہوگئی۔آپؐ نے حضرت زینبؓ کی ہجرت کو ہموار کرنے کی خاطر صحابہؓ سے ازراہِ مشورہ فرمایا اگر تم پسند کرو تو زینبؓ کے خاوند کو بغیر کچھ لئے چھوڑ دو اور اس کے فدیہ میں آیا ہوا مال واپس کر دو۔صحابہؓ نے بخوشی ایسا کیا۔تب حضور ﷺ نے ابو العاص

سے بھی وعدہ لیا کہ وہ حضرت زینبؓ کو مدینہ بھیج دیں گے۔

جنگ بدر کے ایک ماہ بعد حضرت ابو العاص مکہ واپس آئے۔اس دوران حضرت زینبؓ ہند بنت عتبہ بن ربیعہ بن الحارث بن عبد المطلب کے گھر رہائش پذیر رہیں۔ایک روز ابو سفیان کی بیوی ہند نے حضرت زینبؓ کو طعنہ دیا کہ یہ سب تکلیفیں تیرے باپ کی وجہ سے ہیں۔حضورؐ کو جب اپنی بیٹی پر بیتے اس کرب ناک واقعہ کی اطلاع ملی تو آپؐ نے حضرت زید بن حارثہؓ سے فرمایا کہ کیا تم زینبؓ کو میرے پاس لاسکتے ہو؟ حضرت زیدؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ! کیوں نہیں۔چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا میری یہ انگوٹھی لے جاؤ اور زینبؓ کو دے دینا۔حضرت زیدؓ کمال حکمت سے مکہ گئے اور شہر کے نواح میں پہنچ کر جائزہ لینے لگے۔اس دوران حضرت زیدؓ ایک چرواہے سے ملے اور اس سے پوچھا کہ تم کس کے ملازم ہو؟ اس نے بتایا کہ میں ابو العاص کا ملازم ہوں۔پھر حضرت زیدؓ نے پوچھا یہ بکریاں کس کی ہیں؟ اس نے کہا زینبؓ بنت محمد ﷺ کی۔اس پر حضرت زیدؓ نے نبی کریم ﷺ کی انگوٹھی اس چرواہے کے ذریعہ حضرت زینبؓ کو بھجوائی۔انگوٹھی دیکھ کر وہ سمجھ گئیں۔

اگلی رات ابو العاص حضرت زینبؓ کو لے کر نکلے اور یاجج مقام پر انہیں حضرت زیدؓ بن حارثہ کے ساتھ مدینہ روانہ کر کے واپس مکہ آگئے۔اس طرح انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے کئے عہد کی پابندی کرتے ہوئے حضرت زینبؓ کو خاموش حکمت عملی سے مدینہ بھجوانے کا انتظام رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کے مطابق کر دیا۔اور حضرت زینبؓ اپنے مقدس والد آنحضرت ﷺ کے پاس مدینہ پہنچ گئیں۔آنحضرت ﷺ آپؓ کے بارہ میں فرمایا کرتے تھے کہ یہ میری بیٹیوں میں سب سے افضل ہے کیونکہ اس کو میری وجہ سے بہت تکالیف پہنچی ہیں۔

ابو العاص کا قبول اسلام

6 ہجری میں ابو العاص اپنے اور قریش کے اموال لے کر تجارت کی غرض سے شام گئے، آپ بہت امانتدار شخص تھے۔سفر تجارت سے واپسی پر رسول اللہ ﷺ کے بھیجے ہوئے ایک دستے سے ان کی مٹھ بھیڑ ہوگئی جس نے اس تجارتی قافلے کا سارا سامان چھین کر اسے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔یہ اسلامی دستہ جب مدینہ پہنچا تو دوسری طرف ابو العاص بھی اپنا مال واپس لینے کی امید اور درخواست لیکر رات کی تاریکی میں مدینہ پہنچے اور اپنی بیوی حضرت زینبؓ کے پاس پہنچ کر پناہ کے طالب ہوئے۔حضرت زینبؓ نے ان کو امان دیدی۔حضورؐ صبح کی نماز کیلئے مسجد نبوی تشریف لائے تو زینبؓ نے عورتوں کے چبوترہ سے بلند آواز میں کہا، اے لوگو! میں نے ابو العاص کو پناہ دیدی ہے۔حضورؐ نے نماز سے سلام پھیرا تو لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے فرمایا کیا تم نے بھی وہ سنا ہے جو میں نے سنا ہے۔لوگوں نے اثبات میں جواب دیا۔آپؐ نے فرمایا اللہ کی قسم اس معاملے کا مجھے بھی اس سے پہلے پتہ نہیں تھا۔اور میں نے تمہارے ساتھ ہی یہ آواز سنی ہے۔پھر فرمایا مسلمانوں کا سب سے کمزور فرد بھی کسی کو پناہ دینے کا مجاز ہے۔اس کے بعد حضورؐ واپس گھر تشریف لے گئے اور اپنی بیٹی سے فرمایا اے میری بیٹی! ابو العاص کے ٹھہرانے کا اچھا انتظام کرو لیکن وہ ہرگز تمہاری خلوت میں نہ آئے کیونکہ تم بحیثیت مسلمان اس کیلئے اب حلال نہیں۔l بیشک ہجرت سے قبل تک ابو العاص نے (نہ صرف اسلام کی مخالفت نہ کی بلکہ) اپنی اہلیہ سے حسن سلوک کیا اور ان کو اپنے دین پر قائم رہنے دیا۔لیکن ہجرت ان کے درمیان تفریق کا ذریعہ بن گئی۔جیسا کہ ارشاد ربانی ہے یَاأَیُّھَا الَّذِینَ آمَنُوا إِذَا جَاءَکُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُھَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوھُنَّ اللّٰہُ أَعْلَمُ بِإِیمَانِھِنَّ فَإِنْ عَلِمْتُمُوھُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوھُنَّ إِلَی الْکُفَّارِ لَا ھُنَّ حِلٌّ لَھُمْ وَلَا ھُمْ یَحِلُّونَ لَھُنَّ (الممتحنہ:11) یعنی اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تمہارے پاس مومن عورتیں مہاجر ہونے کی حالت میں آئیں تو ان کا امتحان لے لیا کرو۔اللہ ان کے ایمان کو سب سے زیادہ جانتا ہے۔پس اگر تم اچھی طرح معلوم کرلو کہ وہ مومنات ہیں تو کفار کی طرف انہیں واپس نہ بھیجو۔نہ یہ اُن کیلئے حلال ہیں اور نہ وہ ان کیلئے حلال۔اس کے بعد حضرت زینبؓ کی سفارش پر آنحضور ﷺ نے ابو العاص کا سارا مال واپس کر دیا جسے لیکر وہ مکہ چلے گئے قریش کا مال ان کے سپرد کیا اور مدینہ واپس آکر اسلام قبول کر لیا۔

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے اپنی بیٹی زینبؓ کو ان کی ہجرت کے چھ سال بعد ابو العاصؓ کے مسلمان ہونے پر ان کے ساتھ پہلے نکاح پر ہی لوٹا دیا کسی نئے نکاح کی ضرورت نہیں ہوئی۔

زینبؓ کی ہجرت کے باعث رشتۂ ازدواج میں جو روک پیدا ہوئی تھی وہ ابو العاص کے اعلانِ قبول اسلام سے دور ہوگئی۔ہر چند کہ اس دوران حضرت زینبؓ دوسرے نکاح کا اختیار رکھتی تھیں مگر انہوں نے اپنے شوہر کے قبولِ اسلام کے انتظار کو ترجیح دی۔اور یوں چھ سال بعد یہ امید بر آنے پر وہ پھر سے اس رشتہ میں منسلک ہوگئیں۔

حضرت مسورؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر اپنے داماد ابو العاص کا ذکر کیا اور یہ رشتہ نبھانے میں ان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ "اس نے مجھ سے جو کہا سچ کہا اور جو وعدہ کیا اسے خوب نبھایا" اسی بناء پر رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ کسی نکاح کے ذریعہ نئے مہر وغیرہ کی شرائط کی ضرورت نہیں سمجھی۔

حضرت زینبؓ کی اولاد

حضرت زینبؓ کی اولاد میں دو تین بچوں کا ذکر ملتا ہے، جو کم سنی میں فوت ہو گئے۔ایک بیٹی حضرت امامہؓ کی شادی حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ سے ہوئی۔اور ان کی وفات کے بعد حسبِ وصیت حضرت مغیرہؓ سے نکاح کیا۔حضرت زینبؓ کے ایک صاحبزادے علی بن زینبؓ نے بنی غاضرہ قبیلے میں دودھ پیا پھر رسول اللہ ﷺ نے انھیں اپنی نگرانی میں لے لیا۔ابو العاص اس وقت مکہ میں حالت شرک میں تھے۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ حضرت زینبؓ کے ایک صاحبزادے کی وفات کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ صاحبزادی زینبؓ نے آنحضورؐ کو پیغام بھجوایا کہ میرا بیٹا جان کنی کے عالم میں آخری سانس لیتا نظر آتا ہے، آپؐ تشریف لے آئیں۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان کو جاکر سلام کہو اور یہ پیغام دو کہ یہ اللہ کا ہی مال تھا، جو اس نے عطا کیا تھا اور اسی نے واپس لے لیا ہے۔اور ہر شخص کی اللہ کے پاس میعاد مقرر ہے۔اس لئے میری بیٹی صبر کرے اور اللہ سے اس کے اجر کی امید رکھے۔اس پر آپؐ کی صاحبزادی نے دوبارہ پیغام بھجوایا اور قسم دے کر کہلا بھیجا کہ آپؐ ضرور تشریف لائیں۔آپؐ تشریف لے گئے، حضرت

سعدؓ بن عبادہ، حضرت معاذؓ بن جبل، حضرت ابیؓ بن کعب اور حضرت زیدؓ بن ثابت اور کچھ اور اصحاب آپؐ کے ساتھ تھے۔ وہ بچہ آپؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ جس کی جان نکل رہی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ حضرت سعدؓ نے تعجب سے کہا یا رسول اللہ ﷺ یہ کیا؟ آپؐ نے فرمایا یہ محبت ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں پیدا کی ہے۔

بعض روایات میں بیٹے کی بجائے بیٹی کا ذکر ہے جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ایک کمسن بیٹی (نواسی مراد ہے) آخری دموں پر تھی۔ رسول کریم ﷺ نے اسے اپنے سینے سے چمٹایا پھر اس پر اپنا ہاتھ رکھا اسی دوران اس کی روح پرواز کر گئی۔ بچی کی میت رسول اللہ ﷺ کے سامنے تھی۔ رسول اللہ ﷺ کی رضاعی والدہ اُمّ ایمنؓ رو پڑیں۔ رسول کریم ﷺ نے اسے فرمایا اے امّ ایمنؓ! رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں تم روتی ہو وہ بولیں جب خدا کا رسولؐ بھی رو رہا ہے تو میں کیوں نہ روؤں۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا میں روتا نہیں ہوں۔ یہ تو محبت کے آنسو ہیں پھر آپؐ نے فرمایا مومن کا ہر حال ہی خیر اور بھلا ہوتا ہے۔ اس کے جسم سے جان قبض کی جاتی ہے اور وہ اللہ کی حمد کر رہا ہوتا ہے۔

حضرت ابو قتادہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے اور حضرت زینبؓ کی بیٹی امامہ کو اٹھایا ہوا تھا۔ جب آپؐ سجدہ کرتے تو اسے نیچے بٹھا دیتے اور جب کھڑے ہوتے تو اٹھا لیتے۔

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ حضور ﷺ کے پاس نجاشی کی طرف سے کچھ زیورات بطور تحفہ آئے۔ اس میں ایک انگوٹھی بھی تھی۔ جس کا نگینہ ملک حبشہ کا تھا۔ آپؐ نے عدم دلچسپی ظاہر فرماتے ہوئے اسے لکڑی یا انگلی سے پرے کر دیا۔ پھر امامہؓ کو بلایا اور فرمایا۔ بیٹی! اسے تم پہن لو۔ یہی امامہؓ بعد میں پہلے حضرت علیؓ کے عقد میں اور انکی وفات کے بعد حضرت مغیرہؓ کے نکاح میں آئیں۔

حضرت زینبؓ کی وفات

حضرت زینبؓ نے آخر دم تک اسلام کی خاطر تکالیف برداشت کیں۔ وفات کے وقت وہی زخم تازہ ہو گئے تھے جو واقعہ ہجرت میں انہیں پہنچے تھے۔ جب ہبار کے تیروں سے آپؓ اونٹنی سے نیچے جا گریں یا ایک دوسری روایت کے مطابق ہبار کے دھکا دینے پر حضرت زینبؓ ایک چٹان سے جا ٹکرائیں اور یوں آپؓ کا حمل ساقط ہو گیا۔ اسی بناء پر انہیں شہیدہ سمجھا جاتا تھا۔

حضرت زینبؓ کی وفات رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ہی 8 ھ میں ہوئی۔ نبی کریم ﷺ نے ان کے غسل اور تجہیز و تکفین کے لئے خود ہدایات فرمائیں۔ حضرت امّ عطیہؓ بیان کرتی ہیں کہ آنحضور ﷺ تشریف لائے اور ہمیں فرمایا کہ ”زینبؓ کو تین یا پانچ مرتبہ بیری کے پتے والے پانی سے غسل دو۔ اگر تم ضروری سمجھو تو پانچ سے بھی زیادہ مرتبہ نہلا سکتی ہو۔ آخر پر کافور بھی استعمال کرنا۔ جب فارغ ہو جاؤ تو مجھے اطلاع دینا“ وہ کہتی ہیں جب ہم فارغ ہوئے تو حضور ﷺ کو اطلاع دی۔ حضور ﷺ نے اپنا تہہ بند ہمیں دیا اور فرمایا کہ یہ چادر اُن کو بطور جامہ پہناؤ۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کے بالوں کی تین مینڈھیاں بنانا۔ نیز فرمایا کہ اس کا دائیں پہلو سے اور وضو کی جگہوں سے غسل شروع کرنا۔

حضرت زینبؓ کی وفات پر حضور ﷺ ان کی قبر میں اُترے آپؐ غم زدہ تھے۔ جب حضور ﷺ قبر سے باہر نکلے تو غم کا بوجھ کچھ ہلکا تھا۔ فرمایا ”میں نے زینبؓ کے ضعف کے خیال سے اللہ سے دعا کی ہے کہ اے اللہ! اس کی قبر کی تنگی اور غم کو ہلکا کر دے“ اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول کر لی اور اس کے لئے آسانی پیدا کر دی ہے۔

حضرت زینبؓ کی تدفین کے موقع پر آنحضورؐ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا ”ہمارے آگے بھیجے ہوئے بہترین انسان عثمانؓ بن مظعون کے ساتھ جنت میں جا کر اکٹھے ہو جاؤ“ یہ سن کر عورتیں رو پڑیں، حضرت عمرؓ انہیں روکنے لگے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ”رونا منع نہیں مگر شیطانی آوازیں نکالنے یعنی بین کرنے سے بچو۔“ پھر آپؐ نے فرمایا ”وہ دکھ جو آنکھ اور دل سے ظاہر ہو وہ اللہ کی طرف سے ایک پیدا شدہ جذبہ ہے اور رحمت اور طبعی محبت کا نتیجہ ہے اور جو ہاتھ اور زبان سے ظاہر ہو وہ شیطانی فعل ہے“

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

(بحوالہ اہل بیت رسول ﷺ از حافظ مظفر احمد صاحب)

طالبان ایک سے دو ماہ میں

لڑکیوں کو تعلیم کی اجازت دیدیں گے

جنیوا (جنگ نیوز) یونیسیف کے ڈپٹی ایگزیکٹو ڈائریکٹر عمر عبدی نے کہا ہے کہ طالبان بہت جلد ملک بھر میں چھٹی جماعت سے میٹرک تک لڑکیوں کی تعلیم کیلئے اسکول کھولنے کا اعلان کر دیں گے۔ ڈپٹی ایگزیکیٹو ڈائریکٹر عمر عبدی کے مطابق طالبان حکومت کے وزیر تعلیم نے بتایا ہے کہ وہ ایک ”فریم ورک“ پر کام کر رہے ہیں جو تمام لڑکیوں کو چھٹی جماعت سے آگے اپنی تعلیم جاری رکھنے کی اجازت دے گا تاہم اس پر ایک سے دو ماہ میں عمل درآمد ہونا ممکن ہو گا۔ غیر ملکی میڈیا کے مطابق اقوام متحدہ کے ادارے برائے امداد اطفال ”یونیسیف“ کے ڈپٹی ایگزیکٹو ڈائریکٹر عمر عبدی نے گزشتہ ہفتے افغانستان کا دورہ کیا اور جنگ کے زخم خوردہ ملک کے بچوں کی صحت، تعلیم، خوراک اور مستقبل کے حوالے سے طالبان حکومت کے نمائندوں سے گفتگو کی۔

مجھے آج بھی آزادی کی تلاش ہے

تحریر: زینب فاطمہ

میں ایک عام پاکستانی لڑکی ہوں۔ ہر سال 14 اگست کو لوگوں کو جشن آزادی مناتے ہوئے دیکھتی ہوں تو پہلے اپنے من میں ضرور نظر ڈالتی ہوں کہ ایک پاکستانی کی حیثیت سے میں نے اپنے ملک کے لیے بھی کچھ کیا ہے یا نہیں۔ یہی نہیں بلکہ ایک پاکستانی لڑکی ہونے کی حیثیت سے کیا کسی اور خاتون کی زندگی پر مثبت اثر مرتب کیا؟ میں خود کو ایک فیمینسٹ سمجھتی ہوں اور اس میں مجھے کوئی عار نہیں کہ میں عورتوں کے حقوق کے لئے آواز بلند کرنا فرض منصبی سمجھتی ہوں۔

میں آج اپنی دادی کے پاس بیٹھی ان سے تحریک آزادی کے دوران ہونے والے واقعات سن رہی تھی۔ میری دادی نے پاکستان بننے کے بعد امرتسر سے پاکستان ہجرت کی تھی۔ میں ان کی جدوجہد کو سن کر ایسا محسوس کرتی ہوں جیسے ان کا تحریک آزادی میں بہت بڑا ہاتھ تھا اور یہ سچ بھی ہے، چاہے بہن کی حیثیت سے ہو یا بیٹی اور ماں کی حیثیت سے، خواتین نے قیام پاکستان میں بہت سی قربانیاں دیں اور ساتھ ہی ساتھ انہوں نے ظلم و زیادتی کی انتہاوں کا بھی سامنا کیا جو آج کی نسل سوچ بھی نہیں سکتی مگر افسوس، کہانی کا وہ حقیقی پہلو شائد آج کہیں کھو سا گیا ہے۔

یہ صرف قیام پاکستان کے دوران ہونے والے واقعات تک ہی محدود نہیں بلکہ پاکستان کے قیام کو 75 سال بیت چکے ہیں لیکن ہم اب بھی ایک ترقی پزیر قوم ہی ہیں۔ لوگ یہ سن کر حیران ہوتے ہیں لیکن مجھے اس میں حیرانگی کا کوئی پہلو سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری عورتیں آج بھی اسی ظلم و جبر کا شکار ہیں جو وہ پاکستان بننے سے پہلے سے برداشت کرتی آئی ہیں۔ کوئی دن ایسا نہی گزرتا کہ کسی بچی یا خاتون سے زیادتی کی خبر نہ سننے کو ملے۔ میرے دل میں ابھی بھی خوف کے گہرے بادل چھائے ہیں کہ میں نے کل دوسری خوفزدہ لڑکیوں کو یہ کہہ کر کہ شاید اب ایسا نہ ہو کیونکہ وزیر اعظم نے نوٹس لے لیا ہے یا شاید اب ان سفاک جانوروں کے دلوں میں تھوڑا ڈر بیٹھے کیونکہ عورتوں پر کیے جانے والے تشدد اور زیادتی کے خلاف تحفظ نسواں سمیت بل قومی اسمبلی میں پیش کئے گئے۔ لیکن یہ دلاسے اس سلگتے زخم پر نمک چھڑکنے سے زیادہ اور کچھ نہیں کرتے کیونکہ ان مقدس ایوانوں میں بیٹھے قوم کے نمائندے اس بات پر ہی متفق نہیں ہوتے کہ زیادتی کے ملزمان کو سرعام پھانسی دی جائے یا نہیں۔ ان مقدس ایوانوں میں عورتوں کے خلاف ہونے والے تشدد کی روک تھام کے لیے پیش کیے جانے والے بلز میں سے ایک پھر کہیں روک دیا جاتا ہے اور نہ جانے کن وجوہات کی بنا پر منظور ہی نہیں ہوتا۔

اس ملک میں چند ماہ کی بچی سے لے کر بوڑھی ماں تک کو جنسی تشدد کر کے بے بسی کی آگ میں ہمیشہ کیلئے جھلسنے کیلئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں عورت کو بیاہ دینا سر سے بوجھ اتارنے کے مترادف ہے۔ یہاں اب بھی وہ لوگ موجود ہیں کہ جو بیٹی کے پیدا ہونے پر سوگ اور بیٹے کے پیدا ہونے پر جشن مناتے ہیں۔ یہ تو صرف ان واقعات کی ایک جھلک ہے کہ جو رپورٹ ہوتے ہیں، ورنہ کتنے اندوہناک سانحے تو ہم تک پہنچتے ہی نہیں۔ کسی نے شاید درست ہی کہا ہے کہ یہ ملک ترقی نہیں کرے گا جس کی آدھی آبادی ہی گھروں کے اندر بیٹھی ہوئی ہے۔ لیکن ان عورتوں پر صرف جسمانی تشدد ہی نہیں کیا جاتا بلکہ ان کو ذہنی کرب سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ یہ کہانی صرف پاکستان کی نہیں۔ میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ دنیا میں ایک بھی ملک ایسا نہیں جہاں مرد اور عورت کو برابر حقوق دیئے جا چکے ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ خواتین کو حقوق دیئے ہی نہیں جا سکتے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم یہ کام کرنا ہی نہیں چاہتے۔

ہمارے معاشرے میں کچھ ایسے عناصر بھی موجود ہیں جو عورت کو جائیداد میں حق دینے کو لبرلز کی سوچ سمجھتے ہیں اور عورتوں کو آزادی رائے کا حق دینے کو مغربی ایجنڈا قرار دیتے ہیں۔ ایک عورت ہونے ک حیثیت سے میں صرف اپنے ملک کی عورتوں کے لیے ہی پریشان نہیں، مجھے ڈر لگتا ہے کہ افغانستان میں طالبان کے دوبارہ غلبے سے وہاں رہنے والی بچیوں کا بچپن دوبارہ اندھیرے میں ڈوب جائے گا۔ مجھے خوف ہے کہ وہاں رہنے والی مجھ جیسی لڑکیاں تعلیم حاصل نہیں کر سکیں گی بلکہ کم عمری میں ہی جبری طور پر بیاہ دی جائیں گی، حالانکہ لڑکی کی مرضی کے خلاف شادی بھی اسلامی لحاظ سے ایک دھوکہ ہے، حقیقیت میں یہ زنا بالجبر ہی ہے جس کو شادی یا نکاح کا نام دے کر قانونی شکل دینے کی کوشش کی جاتی ہے، ایسا کام کرنے والے ڈریں کہ اگر دنیا میں ان کو سزا نہیں مل رہی تو کیا ہوا، آخرت میں ہمیشہ کی آگ کی سزا ان کا مقدر ہو گی۔

میں آزادی کی وہ جنگ جاری رکھوں گی کہ جو شاید ہم سمجھتے تھے کہ ختم ہو چکی ہے۔ ہم نے یہ ملک اس لیے حاصل کیا تھا کہ یہاں مرد اور عورت اسلامی اصولوں کے مطابق برابری اور آزادی کی زندگی گزار سکیں۔ لیکن ہم یہ حاصل کرنے میں تاحال ناکام ہیں۔ ہم نے ہندوؤں کی غلامی سے نکلنا تھا مگر یہاں ہم کسی اور کے غلام ہیں، شائد اپنوں کے، جو کہتے تو خود کو مسلمان ہیں لیکن ان کی زندگی کے شب و روز ہندووں سے زیادہ مختلف نہیں۔ دوسروں کا حق کھانا، آٹا، چینی غائب کر دینا، غریبوں کی زمینیں ہتھیا لینا، غریب عوام پر بے

تحاشا ٹیکس اور امیروں کو آزادی کہ وہ اربوں کا ٹیکس معاف کروالیں۔ یہ کہاں کا اسلام ہے جبکہ اسلام تو ان عوام دشمن سرگرمیوں کیلئے سخت سزائیں تجویز کرتا ہے۔ آج جو پاکستان میں بڑے بڑے سیاستدان بنے بیٹھے ہیں حقیقت میں شائد یہ اتنے ہی بڑے ڈاکو ہوں۔ ہمیں انسانی معراج کے وہ اعلیٰ اصول اپنانے ہوں گے کہ نچلے طبقے کی عورت کو وہ حقوق ملیں کہ وہ بھی اپنی محنت کے مطابق آمدنی حاصل کر سکے۔ ورنہ جو عورت ہماری ٹیکسٹائل انڈسٹری میں محنت مزدوری کرتے ہوئے صنعتی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی بنی ہوئی ہے، اس کو بھی مرد کے برابر معاوضہ دیا جائے۔ ورنہ تب تک ہم اپنے عظیم قائد محمد علی جناحؒ کے اس کام کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتے کہ پاکستان حقیقت میں عوام کی خوشحالی اور ترقی کا نام ہے۔ یہاں تو جاگیردار، صنعتکار سمیت امیر طبقے نے ہی ترقی کی ہے، غریب تو غریب تر ہوتا جارہا ہے اور اب تو ایک وقت کی روٹی کھانے کو ترسنے پر مجبور ہے۔ ڈریں اس وقت سے جب قدرت کا ہاتھ حرکت میں آجائے اور مزدور کے ہاتھ میں اوزار کی بجائے پتھر ہوں گے اور ان کا حق کھانے والوں کو اپنی جانیں بچا کر بھاگنے کے سوا کچھ نہ سوجھے گا۔

❁❁❁

ہماری زندگیوں کو چیزوں کی کثرت کھا گئی ہے

کسی دور میں دس یا بارہ گانوں والا ایک کیسٹ ہوتا تھا۔ کوئی بہت شوقین ہوتا تو اپنی پسند کی لسٹ دے کر گانے بھرواتا۔ سب گانے بہت مزے سے سنتے تھے اب ہزاروں گانے ہوتے ہیں USB میں اور کوئی پسند نہیں آتا۔

دو تین دوست ہوتے تھے جن سے ہر خوشی غم سانجھا ہوتا تھا۔ جب ضرورت ہو آموجود ہوتے۔ اب سوشل میڈیا پر ہزاروں اور کانٹیکٹ لسٹ میں سینکڑوں لوگ ہیں مگر بے کار۔

یاد پڑتا ہے کہ گھروں میں بمشکل ایک سائیکل ہوتی تھی اسی پر گھر کی ساری شاپنگ بھی ہوتی تھی، سکول ٹیوشنز اور دوستوں سے ملنا بھی۔ یہ سب کر کے بھی فراغت کا وقت بچ جاتا تھا۔ اب گاڑیاں اور بائیکس کھڑی ہوتی ہیں مگر ان پر کام ختم نہیں ہوتے، بھاگ دوڑ میں ایسے دن گزر جاتا ہے پتہ بھی نہیں چلتا۔

اور اس سے بھی مزے کی بات اس ایک سائیکل کو بھی روز پنکچر لگتا یا ٹائر میں سپرنگ والے ہینڈ پمپ سے ہوا بھرنی پڑتی تھی۔ کبھی اس کے کُتے فیل ہو جاتے، تو کبھی ہینڈل "وِنگا" (ٹیڑھا) ہو جاتا، کبھی چین اتر جاتی تو کبھی بریک فیل۔ ان سب مشکلات کے باوجود کبھی کام نپٹانے میں مشکل نہیں پڑتی تھی۔

پورے ہفتے میں سنڈے کو پکچر لگتی تھی اور بدھ کو چترہار۔ اسی کے چکر میں اینٹینے ہلا ہلا کر باولے ہوئے رہتے تھے۔ سارے گھر میں ایک ٹی وی ہوتا وہ بھی ناب یا بٹنوں والا، اور سارے دن میں صرف ایک ڈرامہ لگتا تھا رات آٹھ بجے۔ سب مل کر دیکھتے۔ اب کیبل پر سینکڑوں چینل ہزاروں ڈرامے مگر کسی پر دل نہیں ٹھہرتا۔

پیسے جمع کر کے لائبریری سے کرائے پہ رسالے لائے جاتے اور ایک ہی دن میں پورا ختم کر دیتے۔ گھر میں بچوں بڑوں ہر کسی کی بیڈ سائیڈ پر ناول، رسالہ یا کوئی کتاب ضرور ہوتی جو وہ رات کو پڑھ کر سوتے۔

پیسے ڈال کر وی سی آر منگوایا جاتا، فلموں کی لسٹ بنتی اور گروپ کی شکل میں بیٹھ کر فلمیں دیکھی جاتیں۔ اب تو موبائل پر جب چاہیں فلم دیکھ لیں مگر وہ مزہ اور طلب ختم ہو گئی۔

مجھے یاد پڑھتا ہے گرمیوں میں سر شام صحن میں چھڑکاؤ کر کے چارپائیاں بچھ جاتیں۔ سونے سے پہلے سارے دن کی رپورٹیں ایکسچینج ہوتیں۔ ایک پیڈسٹل فین ہوتا تھا اور لائن میں پانچ سے چھ چارپائیاں ہوتی تھیں۔ دور کی چارپائی تک ہوا مشکل سے ہی پہنچتی۔ اب ہر کمرے میں اے سی ہے مگر نیند غائب۔

وقت کیساتھ ضرورتیں بھی بدل گئیں اور خلوص بھی۔ * جب چیزیں تھوڑی تھیں تب قدر تھی اب ہر چیز کی بہتات ہے پر ناقدری۔ * بس ہماری زندگیوں کو چیزوں کی کثرت کھا گئی۔

❁❁❁

کامیاب عورت اور ناکام ازدواجی زندگی

تحریر: منہا حیدر

خواتین کے بارے میں یہ سوچ کیوں پائی جاتی ہے کہ ورکنگ وومن یا خود مختار خواتین گھر نہیں بسا سکتیں؟ حالانکہ شادی کے بعد نوکری کرنے والے مرد سے زیادہ قربانی دے رہی ہوتی ہے۔

ثنا اور ہادی دونوں میاں بیوی زمانے کے ساتھ ہمقدم ہونے، اپنی بقا اور بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے نوکری کرتے تھے۔ شروع میں ثنا کی نوکری پر خاندان کی طرف سے کچھ اعتراضات ہوئے پر ہادی نے یہ کہہ کر سب کو چپ کروا دیا کہ وہ کفالت میں میرا ہاتھ بٹانے کے لیے ایسا کر رہی ہے۔ دوسری طرف ثنا کا بھی یہی کہنا تھا کہ اس کے تعلیم یافتہ ہونے کا کیا فائدہ کہ اس کی اولاد اچھی تعلیم اور آسائشوں سے محروم رہے۔

شروع میں سب اچھا تھا پر آہستہ آہستہ تلخیاں پیدا ہونی شروع ہو گئیں۔ گھر کے کام وقت پر نہ ہونے کے شکوے، بچوں پر پہلے جیسی توجہ نہ ہونے کا غصہ اور ہادی کو وقت نہ ملنے پر شدید کوفت ہونا شروع ہو گئی۔ مگر اب ثنا کا نوکری چھوڑنا ممکن نہ تھا کیونکہ تنخواہ کے نام پر آنے والی رقم اب گھر کے اخراجات کا لازمی حصہ بن چکی تھی۔

اس بات کا ثنا کو احساس تھا۔ جہاں ثنا نے گھر کی ذمہ داریوں میں حصہ لیا، وہیں غیر محسوس طریقے سے ہادی بچوں کی طرف سے قدرے لاپرواہ ہوتا گیا۔ اس دوران ثنا بچوں کی فیس، کپڑے، کچن گروسری اور گھر کے کئی دوسرے اخراجات میں برابر کی حصہ دار بن گئی۔

مسائل تب بڑھنے شروع ہوئے جب ثنا ذمہ داریوں میں تو حصہ دار کہلائی مگر جب اس کی ذات اور احساس کی بات آئی تو وہاں اسے یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا گیا کہ یہ تو بہت ہمت والی ہے عام عورتوں جیسی نہیں، سہہ لے گی برداشت کر لے گی۔ طبیعت خراب ہو یا ٹھیک اب نوکری چھوڑی نہیں جا سکتی تھی۔

جہاں انتھک محنت سے اس کی ترقی ہوئی، اعتماد بڑھا اور اس نے نوکری کی وجہ سے بہتر پہننا اوڑھنا شروع کیا۔ وقت کی قلت کے باعث خاندانی سیاست سے دور ہوتی چلی گئی۔ اس موقع پر کسی نے ہادی کے ذہن میں یہ کڑوا بیج بو دیا کہ بیوی ہاتھ سے نکل گئی ہے اور تمہاری دسترس سے نکلنے کے لیے یہ سارے ہتھکنڈے اپنا رہی ہے۔

بات بات پر شک اور جرح کی جانے لگی اور گھر میں ایک سرد جنگ سی چھڑ گئی۔ نوکری کے بعد اب وہ فقط پیسے کمانے کی مشین تھی۔

آفس کے بعد ٹی وی، دوستوں کے ساتھ گپ شپ اور آؤٹنگ وغیرہ ہادی کے معمولات ویسے ہی چلتے رہے پر ثنا کی ذمہ داریاں دہری ہو گئیں۔ جہاں اس سے کفیل کی حیثیت سے فرائض پورے کرنے کی امید رکھی جاتی وہاں اس کے لیے احساس ختم ہوتا گیا اور حقوق اتنے بھی نہ رہے جتنے نوکری سے پہلے تھے۔ اس دوران ہادی نے اپنے فرائض سے چشم پوشی کرتے کرتے ثنا کی آنکھوں میں اپنی وقعت مزید کم کر دی۔

ہادی اپنے خاندان میں سب سے چھوٹا تھا پر اپنی ازدواجی زندگی میں وہ اپنے گھر کا سربراہ اور کفیل تھا، ثنا کی روزمرہ ضروریات کے ساتھ وہ اس کی جذباتی ضروریات کو بھی بالکل نظرانداز کرنے لگا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ثنا روز روز کی بحث سے تنگ آ کر یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ ہادی کا اس کی زندگی میں ہونا یا نا ہونا ایک برابر ہے اور وہ روز روز کی لڑائیوں سے اپنے ذہنی سکون اور اپنی پروفیشنل زندگی کو کیوں تباہ کرے۔ وہ یہ موازنہ کرنے پر مجبور ہو گئی کہ مشکل وقت میں نوکری اور تعلیم اس کے کام آئی اور جب بھی اس کو جذباتی یا اخلاقی سہارے کے لیے ہادی کی ضرورت پڑی تو وہ اس کو ایک مخالف محاذ پر ہی دکھائی دیا۔

اس نہج پر پہنچ کر ثنا علیحدگی کے بارے میں سوچنے لگی کہ جب ایک تعلق کے ہوتے ہوئے بھی وہ مکمل تنہا ہے، نوکری کے بغیر گزارہ بھی نہیں، سسرال والے نہ تو اخراجات میں کوئی مدد کرتے ہیں بلکہ الٹا اپنے اعتراضات سے اسی کو مشق ستم بنائے رکھتے ہیں اور بچے بھی ہر وقت کی لڑائیوں سے نفسیاتی دباؤ کا شکار ہیں تو بہتر ہے کہ کہ پرسکون اور بہتر مستقبل کے لیے یہ کڑوا گھونٹ پی لیا جائے۔

ہادی اور ثنا چاہے فرضی کردار ہوں پر اکثریت ورکنگ وومن کی علیحدگی یا طلاق کی وجہ یہی عناصر ہوتے ہیں، عورت مرد کے مقابلے میں زیادہ جذباتی واقع ہوئی ہے اور وہ گھر بنانے اور اسے بچائے رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے کہلائے جاتے ہیں پر اگر سارا بوجھ ایک ہی طرف منتقل ہو جائے اور کوئی جذباتی وابستگی بھی نہ بچے، کمیونیکیشن گیپ یا بات چیت متاثر ہو جائے اور احساس کی بجائے انا کی دیواریں خلیج پیدا کر دیں تو انجام کچھ بہتر نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ عورت اور مرد کی نوکری میں بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ مرد باہر سے کام کر کے واپس آئے تو اس کو کچھ دیر ہی سہی پر آرام کی سہولت ضرور مل جاتی ہے پر عورت باہر سے کام کر کے بھی آئے تو گھر پہ پھر ایک ہاؤس وائف والی ذمہ داریاں ادا کرنی پڑتی ہیں۔

ہمارے ہاں عورت کو امپاور کرنے پہ بات کی جاتی ہے کہ عورت معاشی طور پر مضبوط

ہوجائے، پر ابھی مرد کی یہ تربیت شروع نہیں ہوئی کہ معاشی طور پہ خود مختار عورت کے ساتھ زندگی کیسے گزاری جاتی ہے۔ جو شریک حیات اپنی توانائیاں اولاد اور گھر کی بہتری پر نچھاور کر رہی ہو تو وہ شک، جرح اور بحث کی بجائے زیادہ احساس اور محبت کی حقدار ہوتی ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ ہمیشہ گھر یا تعلق ٹوٹنے کی ذمہ داری صرف مرد پر ہی عائد ہو، معاملات اس سے مختلف بھی ہو سکتے ہیں۔ گھر وہ جائے سکون ہے جہاں انسان تمام کاروبار دنیا کے غموں سے تسکین اور آسودگی کی تلاش کرتا ہے، اب اگر گھر میں ہروقت پیسے یا خرچوں پہ بحث ہو تو اس کا حل یہ ہے کہ دونوں کفالت کا بوجھ اٹھائیں اور اگر پھر بھی بحث شدت اختیار کر جائے تو پھر انسان سکون اور فرار کیلئے کہاں جائے؟

ارد گرد کے ٹوٹے گھروں سے یہی مشاہدہ سامنے آیا ہے، کہیں ایک تحریر پڑھی کہ عورت کو خدا نے اس وصف سے نوازا ہے کہ آپ اس کو کوئی بھی چیز دو، وہ اس کو دگنا کر کے لوٹائے گی۔ آپ اس کو کچن کی گروسری لا دیں وہ آپکو بہترین کھانا دے گی، آپ اسے سیمنٹ، ریت، اینٹوں سے بنی عمارت دیں وہ اسے گھر بنا دے گی۔ آپ فقط نطفہ دیں وہ اولاد جیسا تحفہ دے گی، پر جب آپ اس کی ناقدری کریں، بے حسی اور تحقیر کی مار ماریں گے تو کیا آپ نہیں سمجھتے کہ اس کے ردعمل میں آپکو بھی پھر ایسی ہی کوئی سوغات ملے گی۔

آئے دن ڈراموں اور ہمارے معاشرے کے چند عناصر ورکنگ وومن یا خود مختار عورتوں کے خلاف ذہن سازی کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کام کرنے والی خواتین گھر نہیں بنا سکتیں، باہر کی دنیا کی چکا چوند سے متاثر ہو کر گھر کا سکھ تیاگ دیتی ہیں اور اس طرح کی ایک خاص قسم کی تنگ نظر سوچ پروان چڑھتی ہے۔

بس گزارش فقط اتنی ہے کہ اگلی بار جب کسی عورت کے بارے میں اس طرح کی کوئی ناقص رائے پیش کرنے لگیں تو دس منٹ نکال کر یہ ضرور سوچیں کہ وہ اپنے گھر اور اولاد کے سکھ کی خاطر کیا کچھ تیاگ رہی ہے اور کیا اسے اس کے بنیادی حقوق کے ساتھ ساتھ اتنی مشقت کا کوئی بھی صلہ مل رہا ہے؟ اور پھر اپنی بہن یا بیٹی کو کچھ دیر کے لیے ان حالات میں بھی تصور کریں کہ کیا آپ چاہیں گے کہ کفالت اور گھرداری کے باوجود وہ ذلیل وخوار ہی رہے یا اپنی بہن اور بیٹی کے شوہر کے روپ میں ہادی جیسے کسی مرد کا تصور کر لیں۔ اس کے بعد بھی ضمیر اگر گوارا کرے تو طعن و تشنیع کی سنگ باری اور کردار کشی سے ایسی عورتوں کی زندگی کی مزید مشکل بنائے۔ ❁❁❁

غزل

امۃ الباری ناصر

پہلے اپنا حُسن نکھاروں پھر دوجے سے بات کروں
استغفار میں صبح کروں مَیں استغفار میں رات کروں
گود میں لے کر پیار کروں اور تلووں میں سے خار چنوں
تو مل جائے یا ربّی تو خدمت میں دن رات کروں
ہونٹوں پر مسکان سجاؤں خشک آنکھوں سے نیر بہاؤں
سب کے ہی دکھ درد سمیٹوں کیا ہی میں کرامات کروں
چاند نہ جانے گھومتا گھامتا کب پہنچے کیا بات کہے
میرا اس کا سامنا ہو تو سامنے بیٹھ کے بات کروں
مجھ جیسی حساس کی خاطر ہر پہلو ہر کروٹ دکھ
خون کے گھونٹ پیوں غم کھاؤں یونہی گزر اوقات کروں
حادثے قتل ڈاکے بد امنی قحط رجال اور سیل آب
دیکھوں اس دنیا کی سزائیں اور وردِ آیات کروں
کوئی تو ہو جو سوچ کی ساری راہوں میں میرا ساتھی ہو
کوئی تو ہو جسے اپنا سمجھ کر کھل کر دل کی بات کروں
اپنے حال سے واقف ہوں میں اور بہت شرمندہ ہوں
اپنے خدا کے احساں دیکھ کے دل سے عبادات کروں

❁❁❁

غزل

حمیرا ناصر

تری قربت کا کوئی جب حسیں موسم بناتی ہوں
میں دھڑکن تیز اور سانسوں کو کچھ مدھم بناتی ہوں
وہ اپنے تلخ لہجے سے ہمیشہ زخم دیتا ہے
میں لفظوں کے توقف چن کے پھر مرہم بناتی ہوں
عجب سا اک تعلق ہے ان اشکوں کا مرے دل سے
میں آنکھیں جب بناتی ہوں انہیں پرنم بناتی ہوں
میں شک کا فائدہ دے کر وفا کے ایک مجرم کو
وکیل اس عشق کو کر کے اسے ملزم بناتی ہوں
پکڑ لیتا ہے دل یہ ضد کہ اب یہ بول بھی اٹھے
تری تصویر اب اس واسطے کم کم بناتی ہوں
تصور میں مرے اپنوں کے چہرے جگمگاتے ہیں
تو لمحے جوڑ کر یادوں کا اک البم بناتی ہوں
خیال وفکر کے میرے، پرندے روز مرتے ہیں
میں ان ٹوٹے پروں سے فکرِ تازہ دم بناتی ہوں

❁❁❁

غزل

منصورہ فضل منؔ

آہ و گریہ ہے اور نالے ہیں
آنکھ میں اشک دل پہ چھالے ہیں
ہجر کی لذتیں انوکھی ہیں
عشق کے درد بھی نرالے ہیں
خشک آنکھیں ہیں دل شکستہ ہے
دکھ محبت کے ہم نے پالے ہیں
کتنے آنسوں سنبھال رکھے تھے
اک تبسم میں سب ہی ڈھالے ہیں
ذکر تیرا نہیں بظاہر تو
داستاں میں ترے حوالے ہیں
گھر کو اب لوٹ کر نہیں آنا
اس بیاباں میں صرف جالے ہیں
زخم کیوں ہیں ہرے بھرے اب تک؟
اُسکے تحفے تھے جو سنبھالے ہیں
شامِ فرقت گزر ہی جائے گی
منؔ میں یادوں کے جو اُجالے ہیں

❁❁❁

زرتشتی مذہب کے بارے میں چند اہم اور بنیادی معلومات

ہم جب کسی چیز کے بارہ میں نہیں جانتے ہیں تو اس کے بارے میں معمولی سے معمولی اور چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات اور اصطلاحات پڑتی ہے۔ کچھ اس طرح زرتشتی مذہب ہے جس کے بارے میں ہم بہت کم جانتے ہیں۔ لہذا اس کے لیے تفصیلی مطالعہ اور مطالعہ کے لیے کتب کی کی ضرورت ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ نیٹ کی بدولت ان نایاب کتب تک میری رسائی ہو گی ہے۔ اس لیے اب میں اس سے فائدہ اٹھا رہا ہوں۔

زرتشتیت میں اہورا مزدا جس کے زیر اثر بہت سے خدا شریک ہیں اور ان میں اہورا ایک اعلیٰ خدا ہے اور اس کی پرستش بھی نہیں کی جاتی ہے اور دوسرے خداؤں کی پرستش اس اعلیٰ خدا تک پہنچتی ہے۔ اگرچہ اب صرف اہورا کے بیٹے اتار کی پرستش کی جاتی ہے جب کہ اس کے مقابلے میں انگرومینو (پہلوی اہریمن) کو برا خدا جس کے ساتھ اس کے ساتھی ہیں اور دنیا میں ناپاکی پھیلانا، برائی کا پیدا کرنا، لوگون کو اہورا کی پرستش سے روکنا شامل ہیں۔ اہریمن کو بعض جگہ اہورا کا بھائی اور بعض جگہ اس کا تاریک پہلو بتایا گیا ہے اور دونوں نے مل کر اس دنیا کو تخلیق کیا۔ اہورا اچھی اور فائدہ مند چیز تخلیق کرتا ہے اور اس کے مقابلے مین اہریمن بری، نقصان دہ چیزیں اور بیماریاں تخلیق کرتا ہے۔ ایک جگہ یہ بھی بتایا گیا ہے وہ اہریمن کا خالق نہیں ہے اور وہ اس کو یا اس کے دائرے کو تباہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے۔ شروش جو اہم خدا ہے اس کے بارے میں وینداد میں آیا ہے کہ اس نے دو روحوں کی پوجا کی ہے۔

لیکن اس کا ہرگز مقصد یہ نہیں کہ اہورا بری اور اہریمن اچھی چیزیں تخلیق نہیں کر سکتا ہے۔ اہورا نے تخلیق کیا اور کہا اسے اہریمن تخلیق کرتا تو بہت برا تخلیق کرتا، جو اچھی دنیا کے لوگوں کو بہت نقصان پہنچاتا۔ اس طرح اہریمن نے طاوس (مور) کو تخلیق کر کے یہ بتایا کہ وہ اچھی چیزیں تخلیق کر سکتا ہے۔

اہورا کے پاکیزہ تصورات چھ شخصی تصورات میں ڈھل گئے۔ جنہیں بعد میں فرشتے بتایا گیا ہے۔ اس کے پردے میں وہی قدیم دیوتا مستور ہیں جن کی پوجا کی جاتی رہی ہے۔ مزدایت کے کردار اور خیالات ویدون میں بھی آئے ہیں۔ انہیں گاتھا میں ایک جگہ اہورا کی صفات، زمین پر خدا کے وفادار پیروکار یا اہورا کی ذاتی مخلوق بتایا گیا ہے۔

یہ مذہب یا خیالات ایک شخص کے قرار نہیں دیے جاسکتے ہیں۔ اس کی تعمیر و ترقی میں صدیاں لگ گئیں ہیں اور یہ نظام خدا کی وفادار مخلوق کی وحدت ہے۔ یہ ثنویت بھی نہیں ہے اور نہ تثلث بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ اس میں لاتعداد اچھے اور برے نام نہاد خدا اس نظام کی تشکیل میں حصہ لے رہے ہیں اور اہورا اپنے امرتوں کے ساتھ ایک ہفت وحدت بناتا ہے۔ جو ایک طرح وحدت کی طرح ہے۔ اس طرح یہ ایک کثرت پرستی بھی نہیں ہے۔ کیونکہ انہیں خاص طور شیطانی خدا کی مخالفت نے یکجا کیا ہوا ہے۔ اس طرح یہ وحدت الوجود یعنی تصوف ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس دائرے میں مقدس مخلوق جو خدا ہیں۔ جس میں اہورا مزدا کے ساتھ چھ امرتوں کے علاوہ لافانی سروش (فرمانبرداری) کے علاوہ ویو اور پرہیز گاروں کی علامت کائن (گائے) کی روح ہے۔ جب کہ آگ الوہی پاکیزگی اور طاقت کی علامت بھی شریک ہے۔

اچھے خداؤں کے برعکس شیطانی یا ناراض روحیں جس کے ساتھ ایشما (حملہ اور ظلم و غارت گری) زرتشتیوں پر سب سے بڑا حملہ آور ایک شیطانی خدا جس کے ساتھ، ناپاکی، دھوکہ دہی اور مزید جنوبی پڑوسیوں کے دیوؤاں جو اکامینو (اہریمن) اور ایشما کے عام نمائندے ناپاکی وغیرہ دو اصل روحوں کے وجود (اچھائی اور برائی) میں وہ اصول جن کو مستقبل میں انعامات اور سزائیں ہیں۔ اس عقیدے میں دوہری تخلیق کا اعلیٰ خدا موجود ہوتا تو اس کے وجود میں اچھائی اور برائی کو محدود کرتی۔ مگر دوہرے اصولوں کے مطابق اچھے اصولوں کو سمجھنے کے لیے ایک اچھا خدا بھی ہونا ضروری ہے۔ جو برائی کا مقابلہ اچھائی سے کرے اور کوئی نیکی ایسی نہیں ہے جو گناہ کا مقابلہ نہ کرے۔ اس کے مطابق برے اصول کو سمجھنا جس کی نمائندگی ایک برا خدا کر رہا ہے۔ جس کے پیچھے یہ خیال پنہاں ہے کہ اچھا خدا برائی اور غم کا ذمہ دار نہیں ہے اور اس کی طاقت خود اس کو روک نہیں سکتی تھی اور انسان اس کی مدد کر کے ہی انہیں روک سکتا ہے۔ یہ خیال چاہے کتنا ہی غلط یا صحیح ہو انتہاہی سنجیدہ ہیں۔

بعد از مرگ انعام اور سزائیں جن کی تاویل ہم سائنس سے نہیں کر سکتے ہیں اور اس کی بنیاد عقیدہ ہوتی ہے اور یہ عالم گیر عقیدہ دنیا کے ہر خطہ میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے اور زرتشتیت میں بھی بعد از مرگ اعمال کے مطابق انعامات اور سزاؤں کا وعدہ ہے اور اس عقیدہ کے رکھنے صورت میں ذہنی عادات میں لازمی تبدیلی ضروری ہے۔ اس صورت میں اریتی ایک جسم دیتی ہے اور انسان اور فرشتے اپنا آغاز کرتے ہیں۔ متھرا ان کی اچھے ٹھکانوں کی طرف کی رہنمائی کرتا ہے۔ زرتشتی ان تعلیمات کے تحت مقدس نذریں دیتے ہیں اور ایک پست ذہن کچھ دو کچھ لو کے تحت اس لالچ کو قبول کرتا ہے اور دیوتاؤں کے ساتھ جنگ یا ظلم کے خلاف یا دیوتاؤں کے لیے متحد ہوتا ہے۔ اس اتحاد کے نتیجے میں کائن مقدس لوگوں کے نمائندے کے طور پر ان مصیبتوں پر ماتم کرتے ہیں جو ایرانی زندگی کو بوجھ بناتے ہیں۔ دیوا پرست اور آوارہ گرد قبائل علاقے پر قبضہ کے لیے زرتشتیت کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے۔ چنانچہ زرتشت نے اس ہندوستانی اثر سے چھٹکارے کے لیے محنت کی۔ اس لیے ہمارے پاس نوحہ خوانی، دعائیں، تعریفیں، نصیحتوں کا ایک طومار ہے۔ جس کو زرتشت اور اس کے قریبی ساتھیوں نے اہورہ اور عوام سے مخاطب

کیا ہے۔ ان میں عام اور ذاتی دکھوں کو بیان کرتے ہوئے انفرادی دعائیں اور شکریہ گزاری اور نصیحت ہے۔ خاص یا متواتر اجلاسوں میں عوام کا جمع ہونا، بدترین ذہن کی لالچ اور دیواؤں کے ساتھ جنگ کے گناہ میں ناپسندیدہ ظلم یا غیر ایماندارانہ حصول کے لئے متحد ہو جائیں۔ اس مؤخر الذکر اتحاد کا نتیجہ ظاہر ہو رہا ہے۔ کائن مقدس لوگوں کے نمائندے کے طور پر ان مصیبتوں پر ماتم کرتے ہیں جو ایرانی زندگی کو بوجھ بناتے ہیں۔ دیوتاؤں کے ماننے والے آوارہ گرد قبائل جو کہ علاقے پر قبضے کے لیے اب بھی جدوجہد کر رہے ہیں، ایماندار محنت سے روزی کمانے کی کوششوں کی مخالفت کرتے ہیں، لیکن مایوس نہیں ہوتے۔

یہاں جن آبادیوں میں یہ تسبیحات مرتب کی گئیں وہ بنیادی طور پر کاشتکار اور چرواہے تھے۔ ایسے حالات جنہوں نے ان کے مفادات کو متاثر کیا اور یقیناً یہ سب سے اہم اور ان کی زمین اور مویشی ان کی سب سے قیمتی جائیداد ہوتے تھے۔ جس چیز نے انہیں خوف میں مبتلا کر رکھا وہ سب سے زیادہ خوفناک چیز تھی۔ اس کے مطابق لوٹ مار اور چھاپہ چاہے تورانیوں کی ہو یا دیوتاؤں کو پوجنے والوں سے زیادہ خوفناک اور غیر ملکی سمجھے جاتے تھے۔ ان کی مصیبت غیر معمولی تھی اور اہم دیوتاؤں، امیدوں اور خوف نے ان کی عبادت کو متاثر کیا۔

ہمارے پاس زرتشتیوں کو مغلوب کرنے کے لیے دیوتاؤں کو پوجنے والوں کے بارے میں خاص معلومات ہیں۔ بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے مقصد کو پورا کر چکے تھے۔ اس میں خونی لڑائیوں کا ایک واضح حوالہ اور مختلف قسم کے تشدد کی نشاندہی بارہا ہوتی ہے۔ اوستا میں اس حوالے سے اختلافات موجود ہیں کہ وہ شخص کون تھا۔ اگر کوئی شخص گاتھا میں زرتشت کیا موجود تھا اور کیا وہ واقعی ان قدیم گاتھاؤں کو لکھنے والا تھا؟ کہ وہ ایک حقیقی شخصیت تھی؟ یا اس کی انسانی خصوصیات مکمل طور پر ان افسانوں میں کھو گئی ہیں جن کے ساتھ وقت اور توہم پرستی نے اسے کثرت سے مصالحہ مہیا کیا تھا۔ ویسے بھی اس نظام کی خصوصیات کو مختصر یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اور اس کے ساتھی خدا کی خودمختار طاقت کے تحت ایک بادشاہت قائم کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے جن میں مصائب کو دور کرنا اور ایماندار اور محنتی کو پناہ دینا تھا۔ اس بادشاہت کا مقدس حکم یا بچانے کی صلاحیت کے مطابق انجام دیا جاتا تھا۔ جو تقویٰ کے ذریعے اور مال اور امرت دونوں کے حتمی مقصد کے ساتھ اس اعلیٰ تصور کو ایک اصول کے طور پر نہیں چھوڑا۔ ان موثر اصولوں کی بقا کے لیے معاشرے میں بہت ابتدائی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ ایک درجہ بندی کا نظام موجود ہے۔ مقدس آگ ہے جس کو پہلے ایک پجاری نے جوش خروش کے ساتھ کام کیا۔ لیکن اس کے آثار گاتھا میں بہت کم ہیں اور اس کی تفصیل بہت کم ہے کہ جو مزدائی عبادت کے اس دور میں زرتشتیوں کے طور پر ملتا ہے جب زرتشت گاتھا کے ترانوں کو ترتیب دے رہے تھے۔

❁❁❁

آبگینے خواتین ڈائجسٹ

غزل

فرحت ضیاء راٹھور

ذرا سی بات پہ یوں دل نہال رکھتے تھے
چھپا کے غم کو ہنسی کا کمال رکھتے تھے
ہمی پہ ترک تعلق کا وار ہوتا تھا
سو رابطے بھی سبھی ہم بحال رکھتے تھے
وفا کا پاس جنہیں تھا نہ دوستی کا بھرم
ہم اپنے دوست سبھی با کمال رکھتے تھے
رکاوٹیں تھیں بہت منزلوں کے رستے میں
مگر نہ ٹیڑھی کبھی اپنی چال رکھتے تھے
فقیری عاجزی اور مصلحت کے پردوں میں
ہم اپنی شان میں جاہ وجلال رکھتے تھے
گلے ہزار تھے رنجش رقابتیں بھی ضیاء
عجیب غم تھے جنہیں ہم سنبھال رکھتے تھے

❁❁❁

سورج

فوزیہ عباس شاہ سمّی شارجہ

مارے وحشت کے جو پھر رات نے مانگا سورج
دن نے چڑھتے ہی اسے کھینچ کے مارا سورج
کتنے تاریک ہیں گلیوں کے بدن سارے ہی
کچھ بتاؤ تو کہاں تم نے ہے بیچا سورج
ہائے مر جائے گا سایوں سے لپٹ کر وہ بھی
میرے آنگن میں کسی روز جو اترا سورج
آج بھی مجھ کو طلسمات میں سب باندھیں گے
اک سمندر کا بھنور، اس کا کنارہ، سورج
ہائے جس روز مری نیند کے پر ٹوٹے تھے
میرے کمرے میں بھی اس روز نہ سویا سورج
جل گئے روح میں اترے ہوئے چھالے اس کے
جس نے الفت کے مزاروں پہ سنوارا سورج
چھاؤں لہجے میں بھری دھوپ نے جب بھی سمّی
کرب ہونٹوں پہ لیے "درد" پکارا سورج

❁❁❁

غزل

بشریٰ انجم

ہم جی رہے ہیں حال میں مصنوعی زندگی
دلکش و دلفریب ہے جادوئی زندگی
گردش سے روزگار کی چکرا کے گر پڑی
کس حال کو پہنچ گئی ادھ موئی زندگی
یہ موت تو ہے اصل میں تبدیلئ مکان
مرنے کے بعد پیش ہو گی دُوئی زندگی
جینے کا لطف کیا ہو بھلا انتشار میں
ہے دیکھیے جو اصل میں یکسوئی زندگی
بادِ نسیم ہو کے چلو اے ہواؤ تم
دیکھو بکھر نہ جائے چھوئی موئی زندگی

❁❁❁

مردوں کو قابو میں رکھنے کے رہنما اصول

تحریر: شمائلہ حسین

میں نے کامیاب زندگی کے چند راز کسی نہ کسی طرح جان لیے، پھر سوچا ان چیزوں کو پبلک کر دوں، کیا پتہ کب کس کا بھلا ہو جائے۔ سنا ہے کہ مرد کے دل کا راستہ اس کے معدے سے گزرتا ہے۔ اتنی نفسیاتی، جسمانی اور شخصی الجھنوں کا حل صرف پیٹ بھر دینے تک محدود کر کے کسی سیانی ترین عورت نے اپنا راستہ آسان کیا ہوگا۔ بعد میں باقی معصوم خواتین نے اس بات کو پلے سے باندھ لیا اور مرغن غذائیں کھلا کھلا کے گھر کے مردوں کی توند بڑھا دی۔ مجھ پر یقین نہیں تو خود ہی مشاہدہ کر لیجیے کہ آخر شادی کے چھ ماہ بعد میاں بیوی دونوں ہی باوزن شکم کیوں اٹھائے پھرتے ہیں؟ عورت تو چلیں حاملہ ہو جاتی ہے لیکن میرا سادہ سا سوال ہے کہ میاں کے پیٹ پر چربی بڑھ جانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

اب دھیمے سروں میں کہیے یا با آواز بلند یا پھر مکر جائیے لیکن مرد کے دل کا راستہ جہاں سے ہمارے ہاں کی عورتوں نے تاڑ رکھا ہے اس کا نتیجہ ایسے بڑھے ہوئے پیٹ کے ساتھ ہی سامنے آ سکتا ہے۔ کوئی بڑی بوڑھی سیدھا راستہ کبھی نہیں بتائے گی، آخر استاد اپنے سارے گر تو تھما نہیں دیتا بعد والوں کو۔ میں نے بہت سوچا، لوگوں سے بات کی، روزمرہ زندگی کو چھانا اور شادی شدہ کامیاب زندگیوں کے چند راز میں نے کسی نہ کسی طرح جان لیے، پھر سوچا ان چیزوں کو پبلک کر دوں، کیا پتہ کب کس کا بھلا ہو جائے۔

1۔ اگر آپ کی شادی قسمت سے ہو گئی ہے تو اپنے شوہر کے سامنے ایسے بھولے پن کی اداکاری کریں کہ آپ تو سیدھا بچوں والے جھولے سے نکل آئی ہیں اور انہی کے گھر آ کے دنیا دیکھ رہی ہیں۔ ہر بات پر حیران سی آنکھیں کھول کر دیکھیں۔ اچھا یہ کہاں ہوتا ہے؟ مجھے تو کچھ پتہ نہیں! اس طرح کے جملے آپ پر بہت سی ذمہ داری نہیں آنے دیتے۔

2۔ جب بھی میاں آپ کے قریب آئیں تو ضرورت سے زیادہ شرمانے اور گھبرانے کی اداکاری کرنا نہ بھولیں۔ کیا کر رہے ہیں، کوئی دیکھ لے گا کہنے کے ایکسٹرا نمبر ہیں۔ ایسی چھوئی موئی بیوی دیکھ کر مرد کا سینہ اور بھی چوڑا ہو جاتا ہے۔

3۔ کچن میں کام کرنے جائیں تو اپنی ساس صاحبہ کا مقابلہ کرنے کی فضول کوشش کبھی نہ کیجیے کیونکہ میاں کو تو من و سلویٰ بھی ماں کے کھانے کے سامنے پھیکا محسوس ہوتا ہے۔ لہٰذا جب بھی کھانا لگائیں ساتھ ساتھ یہ ضرور کہتی جائیں کہ ’امی جیسا کھانا میں کہاں بنا سکتی ہوں! امی آپ ہی پکایا کریں نا روز‘۔

4۔ شوہر کی کمائی کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، آپ وہ جتنی مرضی شاپنگ اور آؤٹنگ کیوں نہ کروائے، آپ ہمیشہ اپنی سہیلیوں اور بہنوں کے شوہر کی مثال دے کر اپنی بے قدری کا سیاپا کرتی رہیں۔ چاہے اس ظالم شوہر کے پاس موسم کے دو سویٹر، تین شرٹس اور دو جوتے ہوں، آپ اپنی وارڈروب میں کپڑوں کی کمی کا شکوہ ضرور کریں۔

5۔ اگر آپ بھی کماتی ہیں تو میاں کو یاد کرواتی رہا کریں کہ عورتوں کی کمائی پر مردوں کا کوئی حق نہیں (شوہر پیسہ کمانے کی مشین ہے لیکن اسے یہ احساس غلطی سے بھی نہیں ہونا چاہیے)۔

6۔ اگر بچے پیدا ہو گئے ہیں تو آپ بچوں کے ابا پر احسان جتاتی رہیں اور خرچوں کے بوجھ تلے ایسا دبائیں کہ اسے دوسری عورتوں کی طرف دیکھنے کی فرصت تک نہ ملے۔

7۔ اپنی رائے کو شوہر پر مسلط مت کریں بلکہ اسے سادگی اور خلوص نیت کے ساتھ بات پہنچانے کی ایکٹنگ کریں۔ آخر میں یہ کہنا بھی نہ بھولیں ’باقی آپ زیادہ سمجھدار ہیں مجھے ایسی چالاکیاں کہاں آتی ہیں۔‘

8۔ آزاد خیال عورتوں کے لچھن گنواتی رہیں تاکہ میاں کو آپ کی شرافت اور پاکبازی پر ہمیشہ یقین رہے۔ خود جو چاہے کریں لیکن دوسروں کو دیکھ کر توبہ توبہ کہنے میں کبھی مت چوکیں۔ میرا جسم میری مرضی جیسے نعروں کو برا بھلا کہیں۔ فیمینزم کو گالیاں دیں اس کے بعد بے شک میاں کو مہینوں تک پاس بھی نہ پھٹکنے دیں۔ آپ کے پتی ورتا ہونے کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

9۔ موبائل کبھی میاں کے سامنے استعمال نہ کریں۔ اور اس کے گھر آنے سے پہلے ہر طرح کی چیٹ ڈیلیٹ کر دیں۔

10۔ اگر آپ عمر میں کم ہیں تو میاں کو بوڑھا، گنجا اور موٹا ہونے کا احساس دلاتے رہنا فائدہ مند ثابت ہوگا۔

11۔ اپنے سے زیادہ حسین، ذہین اور جوان سہیلی کو میاں سے نہ ملوائیں ورنہ آپ خوامخواہ سمارٹ اور اپ ٹو ڈیٹ رہنے کی دوڑ میں لگی رہیں گی۔

12۔ اخلاقی اقدار اور خاندانی روایات کو مضبوطی سے تھامے رہیں تاکہ کسی بھی جھگڑے کی صورت میں خاندان آپ کا ساتھ دے۔

13۔ بچوں کی صورت میں اپنا کیمپ مضبوط کرتی رہیں۔ جیسے جیسے وہ بڑے ہوں گے آپ کی حیثیت مسلم ہوتی جائے گی اور میاں صاحب اپنی بیٹھک یا کمرے تک محدود ہو جائیں گے۔

14۔ میاں کچھ بھی کریں، جتنا بھی کر لیں، آپ ہمیشہ ناآسودگی کا اظہار کریں۔ ایک جملہ پلے سے باندھ لیں اور ہر کام کے بعد یہ وظیفہ جاری رکھیں ’بس اتنا ہی؟‘

یہ تو رہی وہ باتیں جو اب تک ناچیز کو سمجھ آئیں۔ بنیادی طور پر ہمارے سسٹم میں نابالغ ذہن کی عورت کو جو مقام اور آسانیاں حاصل ہیں۔ وہ ایک میچیور، دوسروں پر انحصار نہ کرنے والی اور اپنی زندگی خود جی سکنے والی عورت کو کم ہی نصیب ہوتی ہیں۔ شادی شدہ زندگی کی کامیابی کے لیے اوپر بتائی گئی باتوں کا خیال نہ رکھا جائے تو عورتیں عموماً مشکل میں پڑ جاتی ہیں۔ اس سے ہٹ کر جو بات واقعی پلے سے باندھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ مرد کو جذباتی طور پر بلیک میل کرنا ذرا سا بھی مشکل نہیں۔ آپ کے آنسو، عورت کارڈ اور وکٹم پلے بڑے سے بڑے سورما کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ آپ ظلم نہ ہوتے ہوئے بھی زندگی کے اسٹیج پر اداکاری کے فن سے مکمل طور پر واقف ہوں۔

❁❁❁

جواں پاکستان کو بنائیں قوت کا نشاں

تحریر: ربیعہ کنول مرزا

قوم کا سرمایہ روپیہ پیسہ، لباس، چاندی اور سونا نہیں ہوتا بلکہ قوم کی اصل دولت تندرست، ذہین، محنتی، چاق چوبند نوجوان ہوتے ہیں۔ کسی بھی ملک کی اکثریت نوجوانوں پر مشتمل ہونا ایک بہت بڑی نعمت ہے کیونکہ یہی ایک طبقہ ایسا ہے جس کی توانائیوں کو موثر انداز میں استعمال کر کے کوئی انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔

دنیا کی تاریخ میں کوئی بھی انقلاب اور تحریک ایسی نہیں ہے جس میں نوجوانوں کا قابلِ ذکر کردار موجود نہ ہو۔ نوجوانوں کے حوالے سے ہمارے ملک کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں آبادی کی کثیر تعداد نوجوانوں پر مشتمل ہے۔

اقوامِ متحدہ کے ترقیاتی ادارے (یو این ڈی پی) کی سالانہ رپورٹ کے مطابق تاریخ میں پہلی مرتبہ اس وقت پاکستان کی ایک ریکارڈ آبادی نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ پاکستان کی کل آبادی کا 64 فی صد اس وقت 30 سال سے کم عمر افراد پر مشتمل ہے جبکہ 29 فی صد آبادی 15 سے 29 سال عمر کے افراد پر مشتمل ہے۔

اس کا مطلب ہے کہ۔۔ نوجوان یعنی امیدِ اقبال۔۔ زندہ ہے اور پوری آب وتاب سے رواں ہے، بس فکر اقبال نہیں، محرمِ اسرار نہیں، مدبرانہ سوچ نہیں، اور خودی بھی نہیں۔

اس کی وجہ شاید بنیادی سہولتوں کی فراہمی میں کمی اور تعلیم و تربیت کا نہ ہونا ہے، جس کے لیے پہلا بیج ہمیشہ حکمرانوں کو بونا ہوتا ہے۔ نیشنل ہیومن ڈیولپمنٹ کی رپورٹ میں بتایا ہے کہ پاکستان میں سال 2015ء کے دوران نوجوانوں میں بیروزگاری کی شرح 9.1 فیصد تک پہنچ گئی تھی جبکہ 2007ء میں یہ شرح 6.5 فیصد تھی۔

یو این ڈی پی کی رپورٹ " جواں پاکستان کو بنائیں قوت کا نشاں" میں تجویز دی گئی ہے کہ نوجوانوں کو بااختیار بنایا جائے اور انہیں درپیش رکاوٹوں کے اصل اسباب کو دور کرنے کے پر توجہ دی جائے۔

علامہ اقبال کے دنیا سے رخصت ہوجانے کے اتنے برس بعد یہ رپورٹ اقبال کی خواہش کی تکمیل کیلئے کوشاں ہے۔ علامہ اقبال کو نوجوانوں سے خاص لگاؤ تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ نوجوانوں سے ہم کلام ہونے میں خاص کشش محسوس کرتے تھے۔ دراصل نوجوانوں میں کسی پیغام کو قبول کرنے کی نہ صرف صلاحیت ہوتی ہے بلکہ اس کے مطابق زندگی کو تعمیر کرنے کا جذبہ اور عزم بھی ہوتا ہے۔ اقبال کے خیال میں کسی قوم کی ترقی اور عروج کا باعث مال و دولت کی کثرت نہیں بلکہ ایسے نوجوانوں کا وجود ہے جو ذہنی اور جسمانی اعتبار سے صحت مند اور پاکیزہ اخلاق و کردار کے مالک ہوں۔

علامہ اقبال نوجوان کو اس کے مقام سے آگاہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

علامہ اقبال کی خواہش تھی کہ نوجوان ان کا پیغام سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔ صاحبِ کردار بنیں اور صاحب فکر و نظر بھی۔

جوانوں کو مری آہ وسحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

علامہ اقبال نے مستقبل کو ہمیشہ نوجوانوں کی بصیرت، شعور اور آگہی سے عبارت کیا۔ اقبال نوجوان کو مستقبل کا معمار قرار دیتے رہے۔ وہ زندگی کے انداز کو بدل کر نئی جہتوں پر استوار کرنا چاہتے تھے جس کی باگ ڈور نوجوانوں کے ہاتھ ہوتی۔

مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا
مری خاک جگنو بنا کر اڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر

بوسٹن یونیورسٹی سے وابستہ ڈاکٹر عادل نجم اور لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائینسز (لمز) میں معاشیات کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر فیصل باری کی لکھی ہوئی یو این ڈی پی کی رپورٹ "جواں پاکستان کو بنائیں قوت کا نشاں" میں زور دیا گیا ہے کہ نوجوانوں کی معیاری تعلیم، ثمر آور روزگار اور بامعنی شمولیت ملک میں انسانی ترقی کو بہتر بنانے میں کلیدی کردار ادا کر سکتی ہے۔

علامہ اقبال نوجوان کو سرمایہ سمجھ کر ہمیشہ اچھے دنوں کے لیے پرامید رہتے تھے۔

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

ہماری قوم بالخصوص نوجوان نسل میں کوئی کمی نہیں۔ اگر کمی ہے تو صرف ایک دیدہ ور کی، اچھے رہنما کی۔ جو پھر سے سوئی ہوئی قوم کو جگا دے۔

❁❁❁

کشمیر میں باغات کم، چھاؤنیاں زیادہ

تحریر: نعیمہ احمد مہجور

کشمیری کہتے ہیں کہ چند ماہ سے وادی کے دلکش مقام پر اکا دکا مقامی لوگ نظر آتے ہیں لیکن بھارت کے بیشتر وزرا، سیکریٹری اور دوسرے افسر ہر طرف دیکھے جاسکتے ہیں جن کی خدمت پر مقامی انتظامیہ اور پولیس میں غیر کشمیری ملازمین کو پہلے ہی تعینات کیا گیا ہے۔

یہ روایت صدیوں سے قائم ہے کہ برصغیر کے میدانی علاقوں میں گرمی کی شدید لہر سے بچنے کی خاطر کشمیر سیاحوں کی عارضی پناہ گاہ بن جاتی تھی۔ اس روایت کو برقرار رکھتے ہوئے بھارت میں مقیم مختلف ملکوں کے سفیر، بھارتی رہنما اور سرکاری افسر آج کل جموں و کشمیر کے خوبصورت پہاڑوں کی سیر کرتے دیکھے جارہے ہیں۔

مقامی لوگوں کو ملال ہے کہ یہ رہنما سکیورٹی کے سخت پہروں میں رہ کر نہ تو صحت افزا مقامات کا بھرپور لطف اٹھا سکتے ہیں اور نہ مقامی سیاحت کی صنعت کو کوئی فائدہ ہو رہا ہے۔ ان کی رہائش اور کھانے پانے کے انتظام سکیورٹی کے اداروں کی ذمہ داری ہوتی ہے جبکہ سیاحت سے وابستہ مقامی اشخاص کو قریب جانے یا خیریت پوچھنے کی اجازت بھی نہیں دی جاتی۔

حقیقت میں یہ روایت مغلیہ دور سے چلی آرہی ہے کہ موسم گرما میں کشمیر اکثر بادشاہوں یا مہاراجوں کا مسکن بنتا تھا۔ اس کو قائم رکھتے ہوئے ڈوگرہ مہاراجوں نے کشمیر کو گرمائی اور جموں کو سرمائی دارالحکومت قرار دے کر دفاتر کو منتقل کرنے کی بنیاد ڈالی تھی۔ اسے 'دربار موو' سے جانا جاتا تھا۔ حال ہی میں بھارتی حکومت نے دفتروں کی منتقلی کو ختم کرکے جموں کے عوام کو مشکلات میں ڈالا جن کی روزی روٹی دربار موو کی بدولت لاکھوں ملازمین کی جموں آمد سے چلا کرتی تھی۔

مغل بادشاہوں یا ان کے بعد راجے مہاراجوں نے اپنے زمانے میں باغات اور محل قائم کرکے خود بھی لطف اٹھایا اور عوام کی تفریح کے لیے بھی خوبصورت وراثت چھوڑ دی تھی لیکن گزشتہ سو سال سے باغات یا محل کی بجائے صرف فوجی چھاؤنیوں کی تعمیر دیکھی جارہی ہے جواب بھارت کے رہنماؤں کے عارضی مسکن بنتے جارہے ہیں یا ان کے سائے تلے کافی لوگ مستقل سکونت اختیار کرنے کے منصوبے لے کر آتے ہیں۔

اکثر کشمیری کہتے ہیں کہ چند ماہ سے وادی کے دلکش مقام پر اکا دکا مقامی لوگ نظر آتے ہیں لیکن بھارت کے بیشتر وزرا، سیکریٹری اور دوسرے افسر ہر طرف دیکھے جاسکتے ہیں جن کی خدمت پر مقامی انتظامیہ اور پولیس میں غیر کشمیری ملازمین کو پہلے ہی تعینات کیا گیا ہے۔

پہلگام، گلمرگ، سونمرگ اور دودھ پتھری کی خوبصورتی دیکھ کر بظاہر ہر کسی کا دل دھڑک اٹھتا ہے لیکن سکیورٹی کے پہروں میں اس خوبصورتی کا لطف اٹھانا دودھ میں لیموں ملاکر پینے کے برابر ہے۔ اس کا احساس شاید بھارت کے وزیر داخلہ راج ناتھ سنگھ کو بھی ہوا ہے جنہوں نے حال ہی میں پڑوس میں بدلتی صورت حال کے پیش نظر کہا تھا کہ کشمیر کو سنبھالنے میں ابھی مزید وقت درکار ہے۔

یہ محض ایک اتفاق ہے کہ جس روز یعنی 15 اگست کو جموں و کشمیر کے لیفٹیننٹ گورنر منوج سنہا سو فٹ اونچا ترنگا کشمیر کے ہاری پربت یا کوہ ماران پہاڑی پر لہرا رہے تھے، جہاں ماضی میں کشمیر پر قائم درانی سلطنت کے افغان گورنر عطا محمد خان نے ایک قلعہ تعمیر کیا تھا، اس وقت کابل کے صدارتی محل پر طالبان کا پرچم بھی لہرایا جارہا تھا۔

اس اتفاق پر کشمیر کے اطراف واکناف میں محض سرگوشیاں ہو رہی تھیں کیونکہ بھارت کی حکومت نے بات کرنے سے منع کیا ہے۔

مسلم آبادی والے خطے جموں و کشمیر میں دو سال سے تمام تعلیمی ادارے بند ہیں، جامع مسجد سمیت بیشتر عبادت گاہیں مقفل ہیں، محرم کے جلوسوں پر پابندی ہے، کرونا کا جواز دے کر عوام کی نقل و حمل پر قدغن ہے مگر 15 اگست کو یوم جمہوریہ منانے کے لیے بچوں کر گھروں سے نکال کر سٹیڈیم لایا جاتا ہے، ہندو تہوار جنم اشٹمی پر ہندوؤں کو باہر سے لاکر حبہ کدل میں جھانکی نکالی جاتی ہے اور سفری پابندیوں کے باوجود لاکھوں سیاحوں کو وادی لاکر مقامی آبادی کو بدستور محصور رکھا جاتا ہے۔

مقامی آبادی کو قید و بند رکھ کر بھارت کے وزرا سے لے کر بی جے پی کے ہزاروں کارکن اور 10 لاکھ فوج اگر اس خطے کو بزور طاقت زیر کرنے کے ایجنڈے پر کھلے عام کام نہیں کررہے ہیں تو اور کیا کررہے ہیں؟ بھارت کی ایک ارب آبادی سے اس کا جواب پوچھنا چاہیے جو افغانستان میں طالبان کے واپس آنے پر ماتم کررہی ہے اور پھر ستم ظریفی یہ بھی کہ وہ انسانی حقوق کی پاسداری کا واسطہ بھی دے رہی ہے۔

نوٹ: یہ مضمون مصنفہ کی ذاتی رائے پر مبنی ہے ادارے کا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

اپنے بزرگوں کی آخری سانس تک قدر کیجیے

تحریر: نائلہ داؤد

بعض اوقات ایسے بھی مواقع آتے ہیں جب دادی ہمیں نہ کوئی جواب دیتی ہیں اور نہ ہی کوئی اشارہ کرتی ہیں، انہیں دیکھ کر بس کسی بے حرکت قدِ آدم تصویر کا گمان ہونے لگتا ہے۔

کبھی کبھار جب ان کی پڑپوتیاں حوریہ، امامہ یا ثانیہ ان کے ہاتھ کو بوسہ دیتی ہیں تو ان کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں اور جھریوں زدہ چہرے پر مسکراہٹ بکھر جاتی ہے۔ 7 یا 8 برس کی عمر میں بھی وہ جانتی ہیں کہ دادی کا وجود کس قدر اہم ہے۔ کبھی کبھار وہ کسی بات کا جواب نہیں دیتیں، مگر جب دیتی ہیں تو ان کے الفاظ لرزتے ہیں۔ کسی دن وہ یخنی مزے لے لے کر پیتی ہیں تو کسی دن بچے کی طرح منہ بنا کر بیٹھ جاتی ہیں۔

ان کے دماغ میں کیا چل رہا ہے اور انہیں کس چیز کی ضرورت ہے یہ جاننے کے لیے بات چیت کا کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔ 90 برس کی عمر تک تو ان میں جواب دینے کی سکت ہوتی تھی لیکن اب تو کبھی کبھار اپنی بے چینی کا اظہار چہرے کے تاثرات یا بمشکل آہ بھر کر ہی کر پاتی ہیں۔ زمان ومکان کی ناقابلِ عبور گہری رکاوٹوں کے باعث ایک دُوری سی حائل ہے، اور ہم انہیں ایک ایسی کھائی میں اترتے دیکھتے ہیں جہاں رابطے کا کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے۔ شکر ہے کہ کسی مرض کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی ہے اور ان کی حیات کے دھیرے دھیرے بجھتے دیے کی لو کو سہارا دینے کے لیے ہم سب خاندان والے یکجا ہو گئے ہیں۔

ماڈرن لٹریری پرائز کے فاتح ژو ڈاکسن بڑھتی عمر کے نقصانات پر مبنی اپنی کتاب The Sky Gets Dark, Slowly میں خبردار کرتے ہیں کہ 60 برس کی عمر کے بعد آسمان پُراسرار طریقے سے سیاہ تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ روشنی ماند پڑنا شروع ہو جاتی ہے پھر آپ ٹھیک اسی طرح بستر پر لیٹ جاتے ہیں جس طرح آپ اپنی پیدائش کے بعد بستر پر لٹائے گئے تھے۔ بڑھتی عمر کے ساتھ پیش آنے والے مسائل سے نمٹنے کے لیے ژو کے بیان کردہ انتباہات، تفصیلات اور تجاویز دراصل وہ حالات وواقعات ہیں جن کا ہم سب کو آگے چل کر سامنا کرنا ہے۔

وہ بڑی حساسیت کے ساتھ بڑی عمر اور عمر رسیدگی کی پیچیدہ، پوشیدہ اور جذباتی جہانوں کو کھنگالتے ہیں۔ بڑھتی عمر ضروری نہیں کہ ہمیشہ اپنے ساتھ بیماری بھی لائے نہ ہی اسے بوجھ کے طور پر لینا چاہیے کہ جب خاندان والے گھر کے ایک متحرک فرد کو دھیرے دھیرے الگ تھلگ سا محسوس کرنے لگتے ہیں۔

ٹوٹی ہڈیوں، دُکھتے جوڑ اور سُستی و کاہلی کے امکانات کے علاوہ ژو نے تنہائی، عدم توجہی، محبت کے جذبات سے محرومی، دوسروں کی محبت اور چاہت سے محرومی، اور ضروریات اور خواہشات کو ایک طرف رکھ دینے سے بھی خبردار کیا ہے کیونکہ عمر رسیدگی کی خاموشی گمراہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ، 'زندگی میں ایسا وقت بھی آئے گا جب ہمیں 'ممتا' کی ضرورت ہو گی مگر ہمیں بانہوں میں لینے یا بہلا کر کھلانے اور پلانے کے لیے ماں نہیں مل سکے گی'۔

ژو نے اس حالت سے نمٹنے کے لیے geriatric care (بوڑھے بالغوں کی نگہداشت) کی طبی اصطلاح کا استعمال کیا ہے۔ کالج آف فزیشن اینڈ سرجنز پاکستان (سی پی ایس پی) کے قائم مقام صدر ڈاکٹر محمد شعیب شافی کہتے ہیں کہ، 'اب تک ہمارے معاشرے میں بزرگوں کی نگہداشت قریبی رشتہ داروں کا فریضہ بنی ہوئی ہے۔ اہلِ خانہ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن بدلتی سماجی آبادیت اور مدتِ حیات کے ساتھ اب بزرگوں کے لیے ایک باقاعدہ پیشہ ورانہ نگہداشت کو متعارف کروانا ضروری ہو گیا ہے اور ہم سی پی ایس پی میں اس خصوصی نگہداشت کو متعارف کروا رہے ہیں'۔

اس اقدام پر ملنے والے ردِعمل پر خاصے پُرجوش نظر آنے والے ڈاکٹر شافی کہتے ہیں کہ، 'بین الاقوامی طبی کمیونٹی geriatric care کو نہایت اہم گردانتی ہے۔ سی پی ایس پی کے تربیت یافتہ geriatric ماہرین کو عمر رسیدہ بالغان کو درپیش ان مختلف مسائل میں مدد کی غرض سے تربیت فراہم کی جاتی ہے جن کا اظہار اکثر عمر رسیدہ افراد نہیں کر پاتے اور جس کی وجہ سے وہ مسائل نظر انداز ہو جاتے ہیں'۔

'جب آپ ذیابیطس یا سینے کے انفیکشن جیسے کئی مختلف مسائل کا سامنا کر رہے ہوتے ہیں اس وقت ہر مسئلے کو الگ طریقے اور پوری حساسیت سے نمٹنا ضروری ہوتا ہے اس لیے خصوصی مہارت اور اعتماد سازی نگہداشت کے بنیادی جزو بن جاتے ہیں'۔

اب تک کسی بھی پاکستانی طبی ادارے میں geriatric care کو ایک مضمون کی حیثیت نہیں دی گئی ہے۔ چونکہ عمر رسیدہ افراد کی نگہداشت کو ثقافتی اصول اور مذہبی فریضہ تصور کیا جاتا ہے لہٰذا اس کے لیے مطلوب پیشہ ورانہ مہارت کی ضرورت کو بھی محسوس نہیں کیا جاتا۔ ایبٹ آباد انٹرنیشنل میڈیکل انسٹیٹیوٹ کے پروفیسر ڈاکٹر جہانگیر خان کہتے ہیں کہ، 'اس وقت ایک عام اندازے کے مطابق پاکستان کی

آبادی کے صرف 10 فیصد حصے کو geriatric care مطلوب ہے لیکن یہ تعداد تیزی سے بڑھتی جارہی ہے‘۔ وہ کہتے ہیں کہ، ’ہمارے پوسٹ گریجویٹ امتحانات میں اس مہارت کے بارے میں صرف خانہ پری کے طور پر سوالات شامل کیے جاتے ہیں، جس کے نتیجے میں اسے ایک اسپیشلٹی کے طور پر نہیں لیا جاتا اور نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ (دوسری طرف) برطانیہ میں بنیادی طبی کورسز کی تکمیل کے بعد طبی پیشہ وروں کو 6 ماہ کی روٹیشن پالیسی کے ذریعے geriatric care کا تجربہ کروایا جاتا ہے‘۔ ڈاکٹر جہانگیر مزید بتاتے ہیں کہ ’geriatric نرسنگ کے ذریعے جسمانی امراض اور ادویات کی عمومی نگرانی پر تو توجہ دی جاسکتی ہے لیکن اس کے ساتھ نفسیاتی اعتبار سے بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔ جسم کے اعضا اپنی صلاحیت کی آخری حد پر کام کر رہے ہوتے ہیں اور ہر فرد پر ادویات کا ری ایکشن مختلف ہوسکتا ہے۔ ہم طبی مسائل کے بارے میں معلومات کے پھیلاؤ کے لیے میڈیا کا استعمال کرتے ہیں مگر کوئی بھی عمر رسیدہ افراد کی ذاتی اور عوامی ضروریات کے بارے میں بات نہیں کرتا۔ آنے والے برسوں میں geriatric care کو عمر رسیدہ افراد کے مختلف طبی مسائل کے لیے ایک جامع شعبہ کے طور پر اہمیت ملے گی اور اس حوالے سے عوامی آگاہی بھی بڑھے گی‘۔

دادی کو نیبولائز کرنا ہو، چمچ سے کھانا کھلانا ہو، یا سونے کے معمولات میں ان کی مدد کرنا ہو، مطلب یہ کہ ان کے ’وجود کو باقی رکھنے‘ کے لیے در اصل ہمارا پورا گھرانہ اپنی توانائی خرچ کرتا ہے۔ دوسری طرف 93 سالہ ریٹائرڈ سرکاری ملازم مہتاب علی کا خیال رکھنے کے لیے 24 گھنٹے ایک خدمت گار موجود رہتا ہے اور انہیں بار بار ہسپتال لے جایا جاتا ہے۔ بستر پر طویل عرصے تک لیٹنے کی وجہ سے کسی دن جسم پر ہونے والے زخم رسنے لگتے ہیں تو کبھی انہیں سانس لینے میں تکلیف، مسلسل کھانسی یا نہایت کمزوری کی شکایت ہوتی ہے۔

بیوی اور بچوں پر مشتمل گھرانے کے فرد علی کی طبیعت بگڑتی جارہی ہے، geriatric care کی پیشہ ورانہ سروس کے ذریعے ان کی حالت میں بہتری کی امید کی جاسکتی ہے لیکن ایسی سروس دستیاب ہی نہیں ہے۔ ہسپتال میں بھرتی ہوجانے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ وہاں جنرل فزیشن ان کا علاج عام مریضوں کے طور پر ہی کرے گا، چنانچہ ان کی طبیعت میں بگاڑ پیدا کرنے والے مخصوص مسائل نظر انداز ہوجائیں گے۔

پاکستانی ڈاکٹرز اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ جتنا ضروری یہ معاملہ ہے کہ دادی اور ان کے ہم عمروں کے معیارِ زندگی کو بہتر اور خوشحال بنانے کے لیے کیا کرنا چاہیے، بالکل اسی طرح یہ بھی اہم معاملہ ہے کہ یہ کیسے کرنا چاہیے۔

وہیل چیئر پر پوری احتیاط سے بٹھانے یا طویل وقت بستر پر سونے کے باعث ہونے والے زخموں سے بچانے کے لیے انہیں کروٹ بدلنے میں مدد کرنے، یا کپڑے بدلتے وقت سانس لینے میں کسی قسم کی تکلیف پر محتاط نظر رکھنے، کبھی کبھار ان کی طرف دیکھ کر مسکرا دینے یا محبت بھرا اشارہ کرنے سے ان کی طبیعت پر مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ان کی پسندیدہ خوشبو کا اسپرے کرنا اور سانس لینے میں آسانی پیدا کرنے کے لیے نیبولائز کرنا بھلے ہی چھوٹے کام ہیں لیکن جس شخص کا خیال رکھا جارہا ہے اور جو خیال رکھ رہا ہے، یہ کام دونوں کو ہی فائدہ پہنچاتے ہیں۔

دادی کی دنیا کا سیاہ ہوتا آسمان اور ہماری اپنی پُر جوش زندگیاں ایک مخصوص رفتار پر رواں دواں ہیں، مگر ہمارا یقین ہے کہ جو خاموشی ان کی زندگی پر طاری ہوچکی ہے اس کے باوجود ان میں محبت اور نگہداشت کے جذبات، درد اور خوشی کے شعور، اپنی بات کہنے اور دوسروں کی سننے کی اہم انسانی ضرورت کی اہمیت برقرار ہے۔ جب تک عمر رسیدہ شخص کی سانسیں چلتی ہیں تب تک انسانی تعلق اہمیت رکھتا ہے۔

دادی کے گھر والوں اور خیال رکھنے والوں کو ہر حال میں اپنا یہ رویہ قائم رکھنا ہوگا چاہے دادی کی طرف سے کوئی رِدعمل آئے یا نہ آئے۔ آپ ہی بتایئے کہ اگر عمر رسیدہ افراد کو مناسب geriatric care کی فراہمی اور تھوڑی ہمدردی ملے تو کیا پھر بھی ہمیں بوڑھوں کے لیے مخصوص گھروں کی ضرورت پڑے گی؟

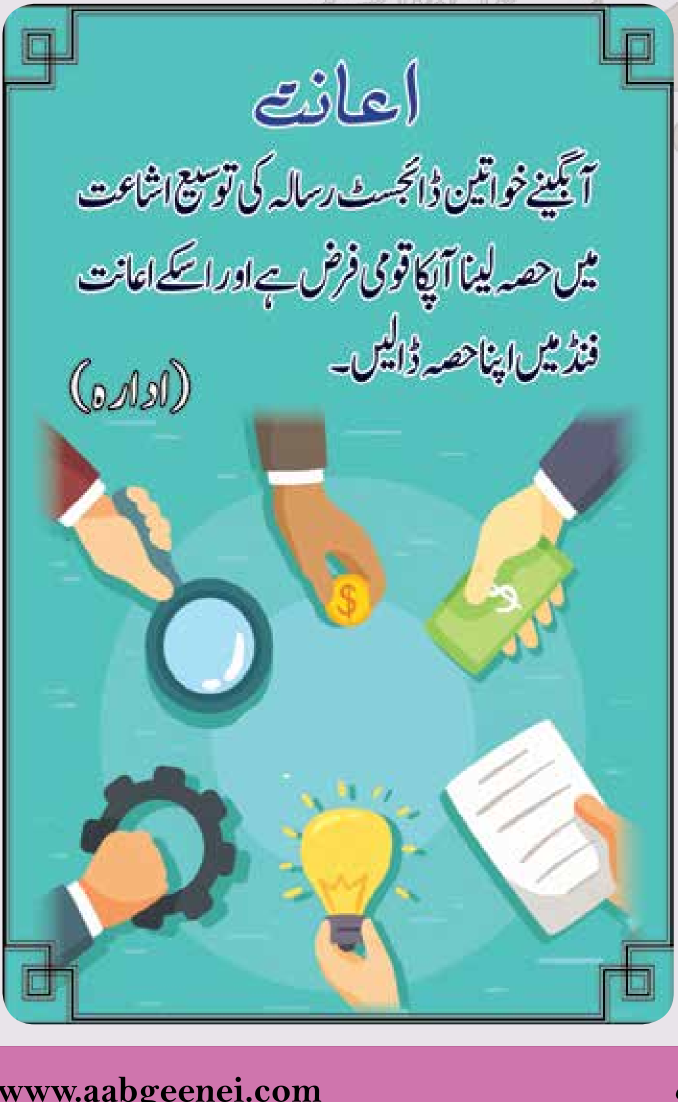

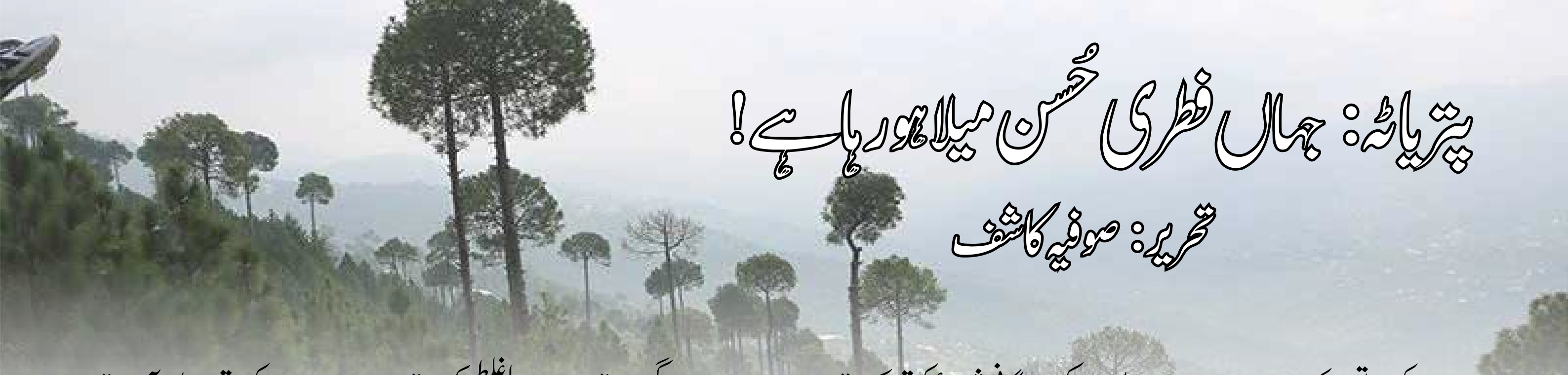

پتریاٹہ: جہاں فطری حُسن میلا ہو رہا ہے!

تحریر: صوفیہ کاشف

پتریاٹہ کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ جب اس حوالے سے کھوج لگانی شروع کی تو ایک قصہ پڑھنے کو ملا۔ معاملہ کچھ یوں ہے کہ ایک بار سبزے اور پہاڑوں سے بھرے ایک خوبصورت اور دلفریب علاقے میں کوئی صدی پہلے برٹش دور میں ایک گورا پہنچا۔ اسے وہ علاقہ بھا گیا اور اس نے وہاں راہ چلتی ایک مقامی خاتون سے اس علاقے کا نام پوچھا۔ اب وہ ہندکو دیہاتی خاتون سر پر آٹا لیے کہیں جا رہی تھی، انگریز نے انگریزی میں کیا پوچھا اس کا تو اس کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہوا مگر اپنے فہم و شعور سے اس نے یہ ضرور اخذ کر لیا کہ ہو نہ ہو اس سے یہی پوچھا گیا ہے کہ اس کے سر پر کیا ہے۔ چنانچہ اس نے بہت ہی شفقت سے انگریز کو بتایا کہ 'پتر آٹا!' اب پتر چونکہ انگریز تھا اور اس وقت ان وادیوں کے انگریز تن تنہا مالک بھی تھے لہٰذا کسی نے اس کا اصل نام جاننے کی کوئی کوشش بھی نہ کی اور اس علاقے کا نام انگریزوں سے ہوتا ہوا 'پتر آٹا' یعنی پتریاٹہ ہی پڑ گیا۔

یہ قصہ کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ، اس کے بارے میں تو کوئی تصدیق موجود نہیں، مگر کہانی دلچسپ ضرور ہے اور علاقہ اس کہانی سے بھی زیادہ حسین اور دلکش ہے۔

3 ماہ سے پتریاٹہ کے کنارے آئے بیٹھے تھے مگر غم روزگار نے فرصت ہی نہ دی تھی کہ اس کی طرف آنکھ بھر کر دیکھ سکیں۔ بڑی کوشش اور جدوجہد کے بعد گھر کے تینوں بڑوں یعنی میاں اور 2 بچوں کو راضی کیا اور ایک دن بالآخر ہم پتریاٹہ یا نیو مری کی زیارت کے لیے روانہ ہو گئے۔ میں نہیں جانتی کہ یہ موجودہ زمانے کا المیہ ہے یا ہر زمانے میں یہی ہوتا تھا کہ بچوں کو گاڑی کے شیشوں سے باہر کسی چیز سے کوئی غرض ہی نہیں۔ باہر سے اٹلی گزر جائے، فرانس گزر جائے یا سوئٹزرلینڈ مگر ان کی نظروں کو کوئی مقام متوجہ ہی نہیں کر پاتا۔ شاید یہ بزرگوں کے کام کی ہی چیز ہے کہ کھڑکی سے باہر نظر آتے ہرے بھرے درخت، جنگلات، پہاڑ اور وادیوں کو دیکھ کر نہیں تھکتے۔ ہمارے بچوں کو سب کچھ اپنے ہاتھوں میں پکڑی چھوٹی سی اسکرین پر دیکھنے کی عادت ہو چکی ہے۔ چنانچہ ٹیبلٹ کی زنبیل میں سے دنیا کے خزانے نکال لینے والے بچے کھڑکی سے باہر متوجہ نہیں ہو پاتے۔ کیا کبھی کسی نے محسوس کیا ہے کہ آج کے زمانے میں سب سے بدترین نشہ انٹرنیٹ، ٹیبلٹ اور سمارٹ فون کا نشہ ہے؟

چنانچہ ان کو اس سفر پر راضی کرنے کا صرف یہی طریقہ تھا کہ کسی نہ کسی کام کے لیے ان کے ہاتھ میں ٹیبلٹ پکڑائے جائیں اور چیئر لفٹ کا وعدہ کیا جائے۔

نیو مری کے چیئر لفٹ پوائنٹ پر پہنچے تو گیٹ پر اترتے ہی ہمیشہ کی طرح میاں نے صلاح دی کہ سامان گاڑی میں چھوڑ دو کہاں اٹھائے پھریں گے۔ اب چونکہ ہم بھی زحمت سے گھبراتے ہیں اس لیے غلطی کرتے ہوئے ہر بار میاں کی باتوں میں آ جاتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے اسنیکس، چھتریاں، جیکٹ سمیت بیگ گاڑی میں چھوڑ دیا اور چیئر لفٹ کی سواری کے لیے خالی ہاتھ پہنچ گئے۔ ٹکٹ گھر پہنچے تو پتا چلا کہ کیبل کار کسی تکنیکی خرابی کے باعث بند ہے۔ شاید اس سفر میں صرف چیئر لفٹ پر سواری ہی ہمارے نصیب میں تھی۔ چھٹی کا دن ہونے کی بنا پر لوگوں کا جمِ غفیر تھا اور چیئر لفٹ پر بیٹھنے والوں کی ایک لمبی قطار اپنی باری کی منتظر تھی۔ ہم نے بھی اپنے بچوں کی عمروں میں کبھی ایک آدھ بار یہ سواری کا لطف اٹھایا تھا۔ اس کے بعد کے 15،20 سال غم جاناں اور غم دوراں میں گزار دیے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے ایڈونچر کی عادت جیسے ختم ہی ہو گئی، لیکن اب جب ڈھلتی عمروں میں بچوں کی خواہش پر تھیم پارک کی سیر کرنی پڑ جائے اور تیز رفتار اور خطرناک رائیڈ پر انہیں بٹھانا پڑ جائے تو خود بھی ساتھ بیٹھنا پڑتا ہے۔ یہ چیئر لفٹ اگرچہ فراری (ferrari) کی تیز رفتار رولر کوسٹر اور وارنر برو (Warner bro) کی اندھیری اور خطرناک آسمانوں سے گرتی سلائیڈ جیسی خطرناک تو نہیں تھی مگر اتنی اونچائی تک دھیرے دھیرے سفر کرنے کی وجہ سے میں اس قدر خوفزدہ تھی کہ اپنی بیٹی کے مقابلے میں نے زیادہ سختی سے راڈ پکڑلی اور پورے راستے آیت الکرسی کا ورد کرتی رہی۔ جوانی بھی کیا چیز ہوتی ہے، جب انسان نہ خطرات کی پرواہ کرتا ہے اور نہ اس کے بارے میں زیادہ فکرمند ہوتا ہے۔ بڑھتی عمر کے ساتھ جیسے جیسے انسان عقل، شعور اور علم سے روشناس ہوتا ہے، وہ بزدل سے بزدل تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ خصوصاً جہاں چیزیں بگاڑنے اور بگاڑے رکھنے کا فیشن ہو اور بگڑی چیزوں کو سنوارنے سے اکثریت ڈھکے چھپے کنی کترا جاتی ہو وہاں محض اتنا علم ہی انسان کے تمام تر مزے لینے کی کوشش کو ضائع کر کے رکھ دیتا ہے کہ کسی تکنیکی یا موسمی خرابی کے باعث اس کے گرنے یا خراب ہونے کے امکانات موجود ہیں۔

وادیوں اور پہاڑوں کی طرف دھیرے دھیرے کھسکتے اس اُڑن کھٹولے پر بیٹھ کر انسان یقیناً جنت کا نظارہ کرتا ہے، خصوصاً اگر جولائی اگست کا مہینہ اور ہریالی بادل اور بارش کے سنگم کے دن ہوں۔ آپ کو 15 سے 20 منٹ کی اس فضائی سیر میں یقیناً دنیا کے خوبصورت ترین نظارے دیکھنے کا موقع میسر آ سکتا ہے۔ راستے میں 4 سے 5 مقامات پر سیکیورٹی کی چوکیاں بنائی گئی ہیں مگر آتے جاتے ہم نے کسی بھی چوکی پر برائے نام بھی کوئی گارڈ نہیں دیکھا۔ ان گارڈز کی جگہ چاک و چوبند فقیر تقریباً ہر سنگ میل پر نظر آئے جن میں بچوں کی کثرت ہے۔ خیر، مناظر کی تمام تر خوبصورتی ان ہرے بھرے درختوں کی تازگی اور ہریالی میں ہے موسم گرما میں چونکہ ان کی خوبصورتی

اپنے عروج پر ہوتی ہے اس لیے چیئر لفٹ کا یہ سفر دلنشیں نظاروں سے بھرپور بن جاتا ہے۔ چوٹی پر اُترے تو تھوڑی مایوسی ہوئی کیونکہ سرکار کی طرف سے اس مقام پر بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں بنائی گئی۔ اس ٹاپ پر چائے کے اڈوں اور ڈھابوں کی اتنی کثرت ہے کہ اترتے ہی پہلے انسان تل دھرنے کی جگہ ڈھونڈتا ہے کہ کہاں پاؤں رکھے جو کسی ڈھابے یا چائے کے کھوکھے پر نہ پڑے۔ جب کوئی اتنی دُور آئے تو اتنے پُرفضا، ٹھنڈے اور خوبصورت مقام پر چائے تو وہ ضرور پیے گا، خاص کر تب جب بیگ بھی گاڑی میں چھوڑ دیا گیا ہو، مگر سب سے پہلے اس کے بیٹھنے کے لیے بہتر جگہ کا سرکاری انتظام لازمی ہونا چاہیے۔ ایک مناسب ریسٹ اور سیٹنگ ایریا کے بعد ڈھابے اور اسٹال بہر حال ضروری ہیں مگر اب صورتحال یہ ہے کہ ٹاپ پر خدا کی زمین اور پہاڑوں کے سوا بیٹھنے کا سرکاری انتظام موجود نہیں ہے۔ ساری جگہ اور کرسیاں ڈھابوں کی ملکیت میں ہیں۔

چنانچہ اگر کسی کا سانس پھول رہا ہے، کسی کو سردی لگ گئی ہے یا کوئی چھوٹا بچہ رو پڑا ہے تو کسی نہ کسی ڈھابے کی کرسی پر ہی بیٹھنا پڑے گا اور نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کچھ خریدنا پڑ جائے گا۔ کیا ہی اچھا ہو اگر اس چوٹی پر اور اس کے آس پاس کی پہاڑیوں پر پارکس اور باغوں کی طرح حکومت کی جانب سے چھپریاں اور ان کے نیچے بینچ بنے ہوں۔ اس طرح لوگوں کے پاس اِدھر اُدھر بیٹھنے کی مناسب جگہ موجود ہوگی اور ہر کوئی اس چوٹی پر ڈھابوں کے گرد اکٹھے ہونے پر مجبور نہیں ہوگا۔

اس کے علاوہ اس پورے ٹاپ پر کچرا پھینکنے کا کوئی مناسب بندوبست موجود نہیں اور وادی نے جیسے خود کو ہی کوڑا دان بنا لیا ہے۔ عوام الناس نے بھی خوب سخاوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کچرا اور استعمال شدہ ڈائپرز ہر جگہ پر پھینک رکھے ہیں۔ شاید ہماری سوچ کے مطابق جہاں ہم کھڑے ہیں صرف وہی جگہ محفوظ ہونے کا حق رکھتی ہے باقی تمام دنیا کچرے کا ڈرم ہے۔ وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک پڑھی لکھی نظر آنے والی خاتون نے بچے کو ذرا سا پرے لے جا کر اس کا ڈائپر بدلا اور اپنی دانست میں اسے گھما کر پرے دُور کسی دوسری دنیا میں پھینک دیا جو بل کھا کر وہیں قریبی دوسری راہ گزر پر جا گرا۔ ایسے پڑھے لکھے اور کھاتے پیتے خاندانوں کے بچوں کے ڈائپرز سے یہ پہاڑی لدی پھدی ہے۔ ڈھابوں نے بھی نہ تو ضرورت محسوس کی ہے نہ ہی انہیں پابند کیا گیا ہے کہ اپنے کوڑے کو سنبھال کر اپنی ذمہ داری پر تلف کریں، یہی وجہ ہے کہ ہر ڈھابے کے پچھلے حصے میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر جمع ہوتے ہیں۔

ہم شور تو بہت مچاتے ہیں کہ پاکستان سیاحت کے لیے بہترین مقام ہے مگر جب گورے یہاں کوڑا دان ڈھونڈیں گے تو آپ ان کو کیسے قائل کریں گے کہ وہ کچرا اٹھا کر اپنے سر سے پیچھے اچھال دیں اور کسی پہاڑی پر بیٹھ کر اپنی ضروری حاجتوں سے فارغ ہو لیں اور یہ کہ اس سے اس کے کردار اخلاق سمیت آپ کی زمین، شہر اور ملک کی تہذیب اور سلامتی پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

یقین کریں کسی بھی مہذب قوم کا گورا کبھی یہ حرکت نہیں کر سکے گا اور یہی وہ ناخوشگوار تاثر ہوگا جو وہ ساتھ لے کر جائے گا کیونکہ ساری دنیا ہماری طرح زمین کو مفت کا کچرا گھر نہیں سمجھتی۔ ہم اپنے بچوں کو آج تک مطمئن نہیں کر سکے کہ ایک ذرا سا بے ضرر چیونگم کسی بھی نکڑ پر بغیر کوئی بڑا نقصان کیے پھینکا جا سکتا ہے تو صدیوں سے تعلیم و شعور سے بہرہ ور قومیں آپ کی اس 'ذرا سی غفلت' کو آسانی سے ہضم نہیں کر سکتیں۔

ویسے اگر وزیرِ اعظم صاحب صرف ایسے مقامات کی صفائی کے لیے ہی نیا عملہ بھرتی کرنا شروع کر لیتے تو سیکڑوں نوکریاں تو ضرور نکل آتیں۔ آخر عرب امارات نے بھی تو صرف صفائی کی مد میں پورے جنوبی ایشیا میں ہزاروں نوکریاں بانٹ رکھی ہیں۔ پاکستان ایک بڑا ملک ہے اور اس میں غربا کی تعداد بھی زیادہ ہے، کیا ہی اچھا ہو کہ یہاں موجود پُرکیف فطرت کے نظاروں سے بھرپور تمام سیاحتی مقامات کی صفائی کے لیے نئے مؤثر محکمے بنائے جائیں اور عملہ بھرتی کیا جائے۔

آپ نے مری میں ہونے والے لڑائی جھگڑوں کی خبریں سنی ہوں گی کہ کس طرح سیاح اور مقامی لوگ دست و گریباں ہوتے ہیں۔ یہ لڑائی جھگڑے کیسے ہوتے ہیں؟ ہم آپ کو بتاتے ہیں۔ اوپر پہنچتے ہی کرسی کی خاطر فٹافٹ چائے پانی کا آرڈر کرنا پڑا۔ بیٹھنے کے لیے ایک نکڑ پر ڈیرہ جما کر، چائے پیتے، کوڑے کے ڈھیروں سے نظر بچا کر اِدھر اُدھر کے خوبصورت نظاروں کو ذرا دیر جی بھر کر دیکھا تو بل دینے کا وقت آ گیا۔ میاں کو بل کچھ مشکوک سا لگا۔ ہم ہوتے تو میتھ کمزور ہونے کی وجہ سے جو سنتے چپ کر کے دے دیتے مگر یہ تو میاں صاحب تھے جن کا بنیادی علم ہی میتھ ہے تو جب ذرا جمع تفریق کیا تو پتا چلا خرچے میں اور حاصل جمع میں 100 نہیں، 200 نہیں، پورے 400 روپے کا فرق تھا۔ واپسی پر پھر وہیں بیٹھے، اسی بیرے نے دوبارہ سے اسی چائے کے بل میں پھر اتنا ہی منافع ڈال دیا یعنی اسے اس بات کی بھی فکر نہ تھی کہ ابھی تو میرا جھوٹ پکڑا گیا ہے۔ صرف یہی نہیں گھوڑے زبردستی آپ کے سامنے لائے جاتے ہیں کہ بیٹھیں! اب بچے بھی للچائی نظروں سے دیکھتے ہیں آپ بھی سوچتے ہیں چلو تھوڑی تفریح ہو جائے گی۔ کرایہ پوچھتے ہیں تو گھوڑے کا مالک اصرار کرتا ہے کہ بیٹھو جی بیٹھو کوئی جہاز کا کرایہ تو ہے نہیں۔ آپ بھی سوچتے ہیں فلاں جگہ 200 کا بچوں نے جھولا لیا تھا چلو ڈبل بھی ہوا تو 400 ہوگا مگر جب ایک کلومیٹر کی سواری کر کے اترتے ہیں تو پتا چلتا ہے 2،2 ہزار کے تین چار گھوڑے آپ لے بیٹھے ہیں۔ اب آپ کو سمجھ تو آ ہی گیا ہوگا کہ یہ لڑائی جھگڑے کیوں ہوتے ہیں؟ اس لیے اپنی سلامتی اور اپنی حلال کمائی کو محفوظ کرنے کے لیے جو بھی بل آئے خود جمع تفریق کر لیں اور گھوڑے کو تب تک ہاتھ بھی نہ لگائیں جب تک اس کے مالک کے منہ سے اس کا بھاؤ نہ جان لیں ورنہ کہیں اگلے دن کی اخبار میں آپ کی خبر ہی نہ لگ جائے۔

ڈھابوں سے جان چھڑا کر ہم ذرا آگے کی جانب بڑھے۔ بادل ہمارے دائیں بائیں اٹکھیلیاں کر رہے تھے اور ان کی شوخیوں کی وجہ سے ہمیں جولائی کے مہینے میں ٹھنڈک محسوس ہونے لگی تھی۔ اتنی دیر میں آس پاس پھیلی بدلیاں اکٹھی ہونے لگیں اور انہی

نرم نرم شفیق بدلیوں نے بارش بن کر ہمیں بگھونا شروع کر دیا۔ اب شدت سے ہمیں یاد آیا اپنا وہ بیگ جو ہم گاڑی میں ہی چھوڑ آئے تھے۔ ہم چونکہ سالہا سال سے عرب امارات کے لق دق صحرا میں رہنے کے عادی ہو چکے تھے جہاں بارش صرف کبھی کبھار منہ دکھائی کے لیے ہی آتی تھی اور وہ بھی مزدوریوں کی مجبوریوں کی وجہ سے صرف شیشے کے پیچھے سے ہی دیکھ سکتے تھے اور دو ٹکوں کی نوکری کے لیے لاکھوں کے ساون کو گنواتے ہی رہے، اس لیے اس طرح کے موسم کے لیے ہم کافی غیر ہو چکے تھے، بلکہ عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ ڈرتے تھے۔ ہم ان علاقوں کو قدرتی مقامات سمجھتے ہوئے یہ خیال کرتے ہیں کہ یہاں سارے کام انسان کو قدرتی طریقے سے ہی کرنے چاہئیں۔ کھلے میں رفع حاجت کرنا، کچرا ساتھ والے کی طرف پھینک دینا ہے، زمین پر بیٹھ جانا ہے، بارش آ جائے تو اس کے ساتھ بہہ جانا ہے، آندھی کے ساتھ اُڑ جانا ہے۔ لیکن ہم بہہ جانا نہیں چاہتے تھے چنانچہ ایک ڈھابے کے چھپر کے نیچے سر چھپانے کی ذرا سی جگہ مل گئی جہاں کھڑے ہو گئے۔ یہ بھی شکر ہوا کہ ہلکی پھلکی بارش تھی کوئی طوفان باد و باراں کا سماں نہ ہو اور نہ ایسی صورتحال میں کیا ہو سکتا تھا اس کا احوال بھی ضرور سُناتے۔

ہماری سیاحت بس اسی پہاڑی کے گرد دو چار چکروں تک محدود رہی، ہجوم سے پرے جانے کی ہمت نہیں کر پاتے کہ جنگل میں درندوں سے ملاقات کا حوصلہ نہ تھا سو ذرا لوگوں کے قریب قریب ہی رہے، مگر یہ ضرور دیکھا کہ جہاں لوگ نہیں بھی جاتے تھے کچرے کے انبار وہاں بھی تھے۔ بہرحال نیومری کی سیاحت پر تکمیل کا ٹک لگانے کے لیے واپسی کی راہ لیتے ہوئے چیئر لفٹ پر سوار ہو گئے۔ چیئر لفٹ پر جو نظارہ واپسی کا تھا وہ روانگی پر قطعی نہیں تھا۔ پوری کی پوری وادی بلندی سے انتہائی مسحور کن منظر پیش کر رہی تھی۔ بدقسمتی سے ہم اپنے کیمرے کی تمام چارجنگ اوپر جاتے اور وہاں پھرتے ختم کر چکے تھے ورنہ آپ کو ضرور دکھاتے کہ خدا نے پاکستان کو کیسی کیسی جنتیں نواز رکھی ہیں۔ پتریاٹہ کا وسیع نظارہ سامنے پھیلا تھا اور دیکھنے والے کا اس منظر میں گمشدہ ہو جانے کو دل کرتا تھا۔ اب تھوڑے اعصاب بھی سنبھل چکے تھے تو ہم میں یہ حوصلہ آ چکا تھا کہ جی بھر کر اس منظر کو جذب کر سکتے سو جی بھر کر نظارہ کیا، اتنا کہ آس پاس سے گزرتے منچلوں کی آوازیں بھی ہمیں متوجہ کرنے میں ناکام رہیں۔

جب گھر کو لوٹنے لگے تو بھوک شدت اختیار کر چکی تھی اس لیے راستے میں ایک ریسٹورنٹ میں ٹھہرے۔ رم جھم پھر سے شروع ہو چکی تھی اور مناظر بارش کے دھند لکے میں چھپ سے گئے تھے۔ ہم نے دبئی اور ابوظہبی کی عام دھند خوب سہہ رکھی ہے جو گاڑی کے اندر سے ٹھنڈی اور کھڑکی کھول دینے پر گرم لگتی تھی مگر یہ خوبصورت نم دیدہ سی دھند کسی پریوں کی داستان کا حصہ لگتی تھی۔ اسی دھند کے کنارے بیٹھ کر کھانا کھایا اور خدا کی تمام نعمتوں پر اس کا شکر ادا کیا اور یہ دعا کرتے گھر کی راہ لی کہ خدا ہمیں اپنی دی گئی تمام نعمتوں کی حفاظت کے قابل کرے! آمین۔ ❀❀❀

ملالہ کا طالبان کے نام خط

لڑکیوں کی تعلیم پر پابندی کو ختم کیا جائے

ملالہ یوسف زئی اور افغان خواتین کے حقوق کے لیے سرگرم متعدد کارکنان نے ایک کھلے خط میں کہا ہے کہ ’لڑکیوں کی تعلیم پر جاری پابندی کو ختم کیا جائے اور لڑکیوں کے سیکنڈری سکولز کو فوراً کھولا جائے۔‘ امن کا نوبیل انعام حاصل کرنے والی پاکستانی طالبہ ملالہ یوسف زئی نے جنھیں پاکستانی طالبان نے گولی مار کر زخمی کر دیا تھا افغانستان کے نئے حکمرانوں پر زور دیا ہے کہ وہ لڑکیوں کو سکول واپس آنے دیں۔ افغان طالبان نے افغانستان میں حکومت قائم کرنے کے بعد سے لڑکیوں کو سیکنڈری سکول واپس جانے سے روک رکھا ہے جبکہ لڑکوں کو کلاس میں واپس آنے کی اجازت ہے۔

طالبان نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ اسلامی قانون کی تشریح کے تحت سکیورٹی اور طلبہ و طالبات کے درمیان سخت علیحدگی کو یقینی بنانے کے بعد لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے واپس آنے دیں گے۔ ملالہ یوسف زئی اور افغان خواتین کے حقوق کے لیے سرگرم متعدد کارکنان نے ایک کھلے خط میں کہا ہے کہ ’طالبان حکام کے لیے۔۔۔۔لڑکیوں کی تعلیم پر جاری پابندی کو ختم کیا جائے اور لڑکیوں کے سیکنڈری سکولز کو فوراً کھولا جائے۔‘ ملالہ یوسف زئی نے مسلم اقوام کے رہنماؤں سے مطالبہ کیا کہ وہ طالبان پر واضح کریں کہ ’مذہب لڑکیوں کو سکول جانے سے روکنے کا جواز نہیں پیدا کرتا۔‘ مصنفین جن میں گذشتہ امریکی حمایت یافتہ حکومت کے تحت افغان انسانی حقوق کمیشن کے سربراہ بھی شامل تھے کا کہنا ہے کہ ’افغانستان اب دنیا کا واحد ملک ہے جو لڑکیوں کی تعلیم پر پابندی عائد کرتا ہے۔‘ مصنفین نے جی 20 کے عالمی رہنماؤں سے مطالبہ کیا کہ وہ افغان بچوں کے تعلیمی منصوبے کے لیے فوری فنڈنگ فراہم کریں۔ خط کے ساتھ اسی معاملے پر دی جانے والی ایک درخواست پر پیر کو چھ لاکھ 40 ہزار سے زیادہ دستخط موصول ہوئے۔

تعلیمی کارکن ملالہ یوسف زئی کو 2012 میں سکول بس میں وادی سوات میں تحریک طالبان پاکستان کے شدت پسندوں نے گولی مار دی تھی۔ ملالہ اب 24 سال کی ہیں اور وہ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے سرگرم ہیں۔ ان کے غیر منافع بخش ملالہ فنڈ نے افغانستان میں 20 لاکھ ڈالرز کی سرمایہ کاری کی ہوئی ہے۔

❀❀❀

کون کس کو مارتا ہے

تحریر: نعیمہ احمد مہجور

ایک ارب بھارتی آبادی میں کسی کی ہمت ہی نہیں ہے کہ وہ وادی میں آ کر پتہ لگائیں کہ جو لوگ دہشت گردی کی آڑ میں کیمیائی ہتھیاروں سے افراد خانہ سمیت گھروں میں جلائے جاتے ہیں اور پھر دوسرے روز ان کی کوئلہ بنی لاشوں کے فوٹو اٹھا کر دہشت پھیلائی جاتی ہے۔ بھارت کے میڈیا نے ابھی چند روز پہلے جس طرح سے کشمیر میں تین ہندوؤں کے قتل پر شور مچایا، کاش اس طرح سے ان 25 کشمیری مسلمانوں کے قتل پر بھی آواز اٹھائی ہوتی تو ہر کشمیری کا سر ندامت سے جھک جاتا جو ویسے بھی پر تشدد حالات کے بوجھ تلے دب گیا ہے۔ کسی شخص کی ہلاکت کی مذمت اگر مذہب کی بنیاد پر کی جاتی ہے تو کیا وہ مذہب صحیح ہے یا مذہب کے ٹھیکے داروں نے سیاست کی آڑ میں انسانیت کا قتل عام کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے، وہ بھی اوچھے سیاسی ہتھکنڈوں سے جو آج کل بھارت کی دوسری ریاستوں میں بھی کھلے عام ہو رہے ہیں۔

آسام کی مثال کافی ہے کہ جہاں ایک نہتے شخص کو گولی مارنے کے بعد لاش پر چڑھ کر بربریت کا مظاہرہ کیا گیا۔ مجال ہے کہ بھارت کی اکثریت کا ایک فیصد حصہ بھی سڑکوں پر آیا ہو۔ کاش اپنی سرکار سے ہی پوچھتے کہ کیا اس غریب کا اتنا بڑا جرم تھا کہ پولیس نے گولی مار کر اسے ڈھیر کر دیا اور سرکاری فوٹو گرافر نے تصویر لینے کی بجائے اس کی لاش پر چڑھ کر مسلمانوں کے تئیں نفرت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ یقین رکھیے اس فوٹو گرافر کو جلد ہی اسمبلی یا پارلیمان کا رکن بننے کے لیے مینڈیٹ دیا جائے گا جیسا کہ چند برسوں سے روایت چلی آ رہی ہے۔ اخلاق خان، پہلو خان، تبریز اور درجنوں افراد کی دل دہلانے والی داستان ہے، جن کی موت ہجوم کے تشدد کے ہاتھوں ہوئی۔

میں جانتی ہوں کہ آپ بھی ابھی وہ ویڈیوز بھولے نہیں ہوں گے جن کو جان بوجھ کر شوٹ کر کے وائرل کیا جاتا ہے تاکہ اقلیت کو بار بار یہ پیغام دیا جائے کہ اگر ’ہندو راشٹر‘ کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے میں کوئی بھی رکاوٹ ڈالی جاتی ہے تو سب کی باری آنے والی ہے۔ برصغیر کے بٹوارے کے وقت جب پاکستان نے اسلامی جمہوریہ بننے کا اعلان کیا تھا تو ہندوستان نے سیکولر بھارت بنانے کا فیصلہ کیا۔ نتیجہ یہ کہ مسلمانوں کو بانٹ دیا گیا مگر کوئی تو ہندوستانی رہنماؤں سے یہ پوچھے کہ سیکولر بھارت بنانے کی بجائے اسی وقت ہندو راشٹر بنانے کا اعلان کیوں نہیں کیا گیا تھا۔ ہندوستانی لیڈر شپ مضبوط تھی اور اس نے کسی دباؤ کے تحت سیکولر ملک نہیں بنایا یا پھر مسلمانوں کی بندر بانٹ کرنے کے لیے سیکولرازم کا یہ ڈراما رچایا گیا تھا جو اب سات دہائیوں کے بعد ختم کرنے کا منصوبہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا 22 کروڑ مسلمان ہندو راشٹر میں خود کو محفوظ تصور کر سکتے ہیں جن کو ابھی سے دبانے، مذہب تبدیل کرنے یا کاروبار سے محروم کرنے کے عمل سے گزرنا پڑ رہا ہے۔

ذرا صبر سے کام لیں، یہی جشن عنقریب ان ہندوؤں کے لیے بھی شروع کیا جائے گا جو اقتصادی بدحالی کا شکار ہو رہے ہیں۔ اب رہا جموں وکشمیر، جہاں ایک کروڑ کی آبادی فوجی چھاؤنی میں خوف اور دہشت میں رہتی ہے، بات کرنے پر یو اے پی اے کا قانون لگا کر بھارت کی بدنام زمانہ جیلوں میں بھیج دیا جاتا ہے، ہر چند میٹر کے فاصلے پر ہر شخص کا شناختی کارڈ دیکھا جاتا ہے، بعض مقامات پر تلاشی لیتے ہوئے برہنہ کیا جاتا ہے، رات کے دوران گھروں میں گھس کر عورتوں سے جنسی زیادتیاں کی جا رہی ہیں، انتظامیہ، عدلیہ اور پولیس بشمول تمام ادارے بھارتی افسروں اور بی جے پی کے سرکردہ سیاست دانوں کے ہاتھوں میں ہیں، اسی جگہ پر حالیہ چند مہینوں میں 25 مسلمانوں اور چار غیر مسلموں کا قتل ہوتا ہے تو کوئی سرکار سے یہ سوال کیوں نہیں کرتا کہ اتنی سیکورٹی کے ہوتے ہوئے کیا مسلمانوں کے لیے ممکن ہے کہ وہ دن دہاڑے سڑک پر آ کر گول گپے والے بہاری کو، بنکر کے سامنے اقبال پارک میں کیمسٹ بندرو کو اور عید گاہ میں سکھ ٹیچر کو ہلاک کرنے کے اہل ہیں؟

مسلمان ہر طرح سے بے اختیار کر دیے گئے ہیں، جن کی زمینیں چھینی جا رہی ہیں، جن کے مکانات بارود سے اڑائے جا رہے ہیں، جن کو روزگار سے محروم کر دیا گیا ہے اور دن رات این آئی اے کے سینکڑوں چھاپوں سے بے یارومددگار کر دیا گیا ہے، جو اس وقت صرف اپنی زندگی کو بچانے کی فکر میں ہیں۔ وہ کیا اتنی ہمت رکھتے ہیں کہ وہ کسی اور کو قاتلوں سے بچائیں جبکہ وہ خود ہر روز چار پانچ کے حساب سے سیکورٹی فورسز کے ہاتھوں قتل ہو رہے ہیں۔ ایک ارب بھارتی آبادی میں کسی کی ہمت ہی نہیں ہے کہ وہ وادی میں آ کر پتہ لگائیں کہ جو لوگ دہشت گردی کی آڑ میں کیمیائی ہتھیاروں سے افراد خانہ سمیت گھروں میں جلائے جاتے ہیں اور پھر دوسرے روز ان کی کوئلہ بنی لاشوں کے فوٹو اٹھا کر دہشت پھیلائی جاتی ہے۔ کیا وہ دوسروں کو نشانہ بنانے کی جرات کر سکتے ہیں، کیا کشمیر میں انسانی حقوق کے عالمی قوانین کی دھجیاں نہیں اڑائی جا رہی ہیں، جن کی شقیں بھارتی آئین میں ابھی تک موجود ہیں۔

کوئی حکومت سے یہ پوچھنے کی جسارت کیوں نہیں کر رہا کہ لکھمی پور کھیری میں آٹھ سکھوں اور ہندوؤں کو وزیر داخلہ کے بیٹے نے گاڑی چڑھا کر روند ڈالا۔ پھر اس واقعے کی تحقیقات بھی اسی وزیر کی نگرانی میں ہوئیں، جس نے بیٹے کو چھپا کر کہیں رکھ دیا تھا اگر سپریم کورٹ وقت پر نہیں جاگتی۔ وزیر صاحب اپنی کرسی پر نہ صرف براجمان ہیں بلکہ انسانی حقوق پر بھاشن دینے کے لیے کئی اجلاسوں میں دیکھے گئے ہیں۔

کشمیری اکثر سوشل میڈیا پر گلہ کرتے ہیں کہ بھارت کے اکثر لوگ ان پر جاری ظلم و تشدد پر جشن کیوں مناتے ہیں، ان سے کہنا چاہیے کہ جب ایسے ہی پروگرام ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں بھی شروع کیے جائیں گے تو انہیں خود ان حالات کا احساس ہوگا۔

ذرا صبر سے کام لیں، یہی جشن عنقریب ان ہندوؤں کے لیے بھی شروع کیا جائے گا جو اقتصادی بدحالی کا شکار ہو رہے ہیں، روزگار سے محروم ہیں، دوا کے لیے پیسے نہیں ہیں اور ہندوتوا کی روٹیاں اب بھوک بھی نہیں مٹاتی ہیں۔

معروف طلبہ لیڈر کنہیا کمار نے حال ہی میں ایک تقریر کے دوران کہا تھا کہ بھارتی عوام کے پاس دو ہی آپشنز ہیں، بھگت سنگھ یا ویر ساورکر؟ دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ضروری ہے۔ اب یہ بھارت کے عوام کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ کس کا انتخاب کریں گے تاکہ ملک کے مستقبل کا سیاسی نقشہ واضح ہو سکے۔

موجودہ پرتشدد حالات کے پیش نظر اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے ادارے کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ غیر جانبدار کمیشن قائم کرکے ہر اس ہلاکت کی جانچ کرے جو جموں و کشمیر میں گذشتہ تین دہائیوں سے ہو رہی ہیں۔ انسانی حقوق کے عالمی اداروں کی شبیہ اس وقت تار تار ہوتی ہے، جب وہ مذمت کرنے کی ایک مخصوص سوچ کا انتخاب کرتے ہیں۔

کشمیری قوم کو بھی اس دن کا انتظار کرنا ہوگا۔ اس وقت سب سے بڑی ترجیح اپنی زندگی کو بچانا ہے، اپنے آس پاس رہنے والی ان اقلیتوں کو بھروسہ دلانا ہے جو سیاست کے ٹھیکے داروں کے ہاتھوں قربانی کا بکرا بنتی جا رہی ہیں۔

❁❁❁

کیا آپ ڈینگی بخار کی علامات سے واقف ہیں؟

ڈینگی بخار دنیا بھر میں مچھروں سے سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا مرض ہے اور یہ 4 اقسام کے ڈینگی وائرسز کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پاکستان میں بھی اس وقت مختلف شہروں میں ڈینگی کے کیسز میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک تخمینے کے مطابق دنیا بھر میں ہر سال 40 کروڑ افراد کو ڈینگی انفیکشنز کا سامنا ہوتا ہے جن میں سے 9 کروڑ 60 لاکھ افراد بیمار ہوتے ہیں۔ ڈینگی بخار مچھروں کی ایک قسم Aedes کے کاٹنے سے ہوتا ہے جو خود ڈینگی وائرس سے متاثر ہوتا ہے اور کاٹنے کے بعد خون میں وائرس کو منتقل کر دیتا ہے۔ مگر یہ بیماری ایک سے دوسرے فرد میں براہ راست نہیں پھیل سکتی۔

ڈینگی کی علامات

ڈینگی کی علامات عموماً بیمار ہونے کے بعد 4 سے 6 دن میں ظاہر ہوتی ہیں اور اکثر 10 دن تک برقرار رہتی ہیں۔ ان علامات میں اچانک تیز بخار، شدید سر درد، آنکھوں کے پیچھے درد، جوڑوں اور مسلز میں شدید تکلیف، تھکاوٹ، قے، متلی، جلد پر خارش (جو بخار ہونے کے بعد 2 سے 5 دن میں ہوتی ہے) خون کا معمولی اخراج (ناک، مسوڑوں سے یا ہلکی سی خراشیں پڑنا) قابل ذکر ہیں۔ اکثر اوقات علامات کی شدت معمولی ہوتی ہے اور انہیں فلو یا کسی اور وائرل انفیکشن کا نتیجہ بھی سمجھ لیا جاتا ہے۔

چھوٹے بچوں اور ایسے افراد جو پہلے ڈینگی سے متاثر نہ ہوئے ہوں، ان میں بیماری کی شدت زیادہ عمر کے بچوں اور بالغ افراد کے مقابلے میں معمولی ہوتی ہے۔ مگر سنگین مسائل کا خطرہ ہر مریض میں ہوسکتا ہے جیسے ڈینگی ہیمرج بخار جو بہت تیز بخار کی ایک پیچیدگی ہے، لمفی اور خون کی شریانوں کو نقصان پہنچنا، ناک اور مسوڑوں سے خون بہنا، جگر بڑھ جانا اور گردشی نظام فیل ہونا۔ سنگین علامات کے نتیجے میں خون کا اخراج بہت زیادہ بڑھ سکتا ہے اور موت کا خطرہ بھی بڑھتا ہے۔ کمزور مدافعتی نظام کے مالک افراد یا دوسری یا کئی بار ڈینگی کا سامنا کرنے والے لوگوں میں ڈینگی ہیمرج بخار کا خطرہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔

ڈینگی کی تشخیص اور علاج

ڈاکٹر ڈینگی کی تشخیص ایک بلڈ ٹیسٹ سے کر سکتے ہیں۔ ابھی ڈینگی انفیکشن کے علاج کے لیے کوئی مخصوص دوا موجود نہیں اور اگر آپ کو لگتا ہے کہ آپ کو ڈینگی ہے درد کش ادویات جیسے پیراسیٹامول استعمال کر سکتے ہیں مگر اسپرین سے گریز کرنا ضروری ہے، کیونکہ وہ خون کا اخراج بدتر کرسکتی ہے۔ مریضوں کو آرام، زیادہ پانی پینے اور ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے اور اگر بخار کم ہونے کے بعد اولین 24 گھنٹوں میں حالت زیادہ خراب محسوس ہو تو فوری ہسپتال جا کر معائنہ کرانا چاہیے۔

احتیاطی تدابیر

ڈینگی سے بچاؤ کے لیے ابھی کوئی ویکسین دستیاب نہیں تو اپنے تحفظ کے لیے موسکیٹو ریپیلنٹس کا استعمال کریں چاہے گھر یا دفتر سے باہر ہو یا چار دیواری کے اندر، گھر سے آستینوں والی قمیض اور پیروں میں جرابیں پہنے، گھر میں اے سی ہو تو اسے چلائیں، کھڑکیاں اور دروازوں میں مچھروں کی آمد روکنا یقینی بنائیں، اے سی نہیں تو مچھروں سے بچاؤ کے نیٹ استعمال کریں۔ اسی طرح مچھروں کی آبادی کم کرنے کے لیے ان کی افزائش کی روک تھام کی تدابیر پر عمل کریں جیسے پرانے ٹائروں، گلدان اور دیگر میں پانی اکٹھا نہ ہونے دیں۔ اگر گھر میں کسی کو ڈینگی ہوگیا ہے تو اپنے اور دیگر گھر والوں کے تحفظ کے لیے بہت زیادہ احتیاط کریں جس متاثرہ فرد کو جن مچھروں کے کاٹنے سے ڈینگی ہوا وہ گھر میں دیگر افراد میں بھی اس بیماری کو پھیلا سکتے ہیں۔

❁❁❁

’کاش مرنے سے پہلے ایک بار اپنا گھر دیکھ سکوں‘

تحریر: بینش صدیقہ

جنوری 1932 کو راولپنڈی میں پیدا ہونے والی رینا ورما کا تعلق ایک پڑھے لکھے روشن خیال گھرانے سے ہے۔ ان کے والد برطانوی حکومت میں آفیسر تھے۔

بھارت کے شہر پونا میں رہنے والی رینا ورما (توشی آنٹی) اگلے سال 90 برس کی ہوجائیں گی لیکن تقسیم کے 74 برس بعد بھی ان کا دل راولپنڈی کی یادوں میں کھویا ہوا ہے۔ 1947 میں برصغیر کی تقسیم کے ساتھ ہی اس خطے سے لاکھوں لوگوں کو ہجرت کرنا پڑی۔ اپنے گھر، محلے علاقے کی یادیں آج بھی لاکھوں لوگوں کے دلوں کو بے چین کرتی ہیں۔

تقسیم سے قبل راولپنڈی میں ان کی رہائش دیو کالج روڈ پر تھی۔ جس کے پاس کمپنی گارڈن اور گورڈن کالج موجود تھے۔ جو اب لیاقت باغ اور لیاقت روڈ کے نام سے جانے جاتے ہیں انہوں نے ماڈرن سکول راولپنڈی سے 14 برس کی عمر میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اپنے زمانے کی پنڈی کی یادیں تازہ کرتے ہوئے کہتی ہیں، وہاں سب محبت سے رہتے تھے۔ کچھ ملنے والے مسلمان اور ہندو ایک دوسرے کے گھروں میں کھانا پینا درست نہیں سمجھتے تھے ان سے اختلاف کی بجائے سوچ کا احترام کیا جاتا تھا۔ لیکن زیادہ تر لوگ ان باتوں کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ بڑی بہن کی سہیلی غلام فاطمہ اور بھائی کے دوست شبیر انہیں آج بھی یاد ہیں جو ایسے ملتے اور گھر میں ایسے کھاتے پیتے تھے جیسے ان کا اپنا گھر ہو۔

ہم نصابی کتابوں میں ہمیشہ پڑھتے رہے کہ فسادات میں مسلم خاندانوں کو کیسے نیزے میں پرو دیا گیا۔ لیکن یہ فسادات یک طرفہ نہیں تھے۔ ہندو اور سکھوں کو بھی ایسے ہی دنگے فسادات اور حملوں کا سامنا تھا۔ توشی آنٹی بتاتی ہیں کہ 1947 کے فروری مارچ سے راولپنڈی میں بھی فسادات شروع ہو گئے۔ اس وقت گلیوں میں باری باری پہرہ دیا جانے لگا۔ ایک گھر کے بڑے سے حصے میں پورے محلے کے لیے جگہ بنادی گئی تاکہ شرپسندوں کے حملے کے وقت سب ایک جگہ جمع ہو جائیں جن گھروں میں بیٹیاں تھیں وہ لوگ بہت پریشان تھے۔ فوج کے ایک میجر صاحب انہیں اور محلے کی دیگر لڑکیوں کو فوجی کیمپ میں لے گئے چند دن بعد حالات بہتر ہونے پر گھر واپس آ گئے۔

کچھ دن بعد توشی آنٹی کی والدہ مارکیٹ گئیں تو حالات پھر کشیدہ ہو گئے۔ دکانیں بند کرادی گئیں۔ وہاں ایک جاننے والے درزی جن کا نام شفیع تھا، انہوں نے رینا کی والدہ کو اپنی دکان مین چھپالیا۔ کئی گھنٹے بعد صورتحال بہتر ہونے پر وہ ان کی بیٹی کو خود گھر چھوڑ کر گئے۔ رینا کا خاندان تقسیم کے اعلان سے ایک ماہ مئی 1947 میں قبل ہندوستان چلا گیا تھا۔ وہ کہتی ہیں ہم ہر سال گرمیوں کی چھٹیاں مری میں گزارتے تھے اس سال ممی پاپا نے ہمیں شملہ بھیج دیا۔ دو ماہ بعد وہ بھی ضروری سامان سمیٹ کر ہمارے پاس آ گئے۔ اس دوران دونوں ممالک کے درمیان باقاعدہ تقسیم ہو گئی لیکن ہم سب کے وہم و گمان میں بھی کہیں یہ نہیں تھا کہ ہم واپس اپنے گھر نہیں جائیں گے۔ ممی نے ہمیں وہاں گھر نہیں لینے دیا کہ ہم واپس پنڈی اپنے گھر جائیں گے۔ ممی تو اپنا گھر چھوڑنے کا سوچ ہی نہیں سکتیں تھیں، کہتی تھیں کہ پہلے برٹش راج تھا اب مسلمانوں کا ہوا تو کیا ہوا۔ تقسیم ہم سے ہمارا گھر تھوڑی چھین سکتی ہے۔ لیکن پھر ماحول ایسا بن گیا کہ ہم کبھی بھی اپنے گھر واپس جا ہی نہیں سکے۔

تقسیم کی لکیر بھی ان کے دل سے اپنے شہر کی محبت نہیں نکال سکی۔ انہوں نے پاکستان آنے کے لیے کئی بار پاسپورٹ بنایا لیکن وہ پنڈی نہیں آ سکیں۔

1954 میں لاہور میں ہونے والے پاک بھارت میچ میں حکومت پاکستان نے بغیر ویزہ آنے کی سہولت دی جس کا انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے لاہور کا دورہ کیا لیکن اپنے گھر اور شہر کی یادیں انہیں 90 برس کی عمر میں بھی بے چین کیے ہوئے ہیں۔ فیس بک پر کئی پاکستانی ان کے فرینڈز ہیں جن میں سے ایک پنڈی سے تعلق رکھنے والے سجاد حیدر بھی ہیں جنہوں نے توشی آنٹی کو ان کے گھر کی تصاویر اور ویڈیوز بنا کر بھیجیں۔ وہ گھر جو آج بھی ان کے خوابوں میں آتا ہے بالکل ویسا ہی ہے جیسا ان کے بچپن میں تھا۔ رینا کہتی ہیں، ٹھیک ہے وہاں کوئی اور رہتا ہے لیکن مجھے تو وہ آج بھی اپنا گھر لگتا ہے۔ عمر کا کوئی بھروسہ نہیں کاش ایک بار اپنا گھر دیکھ سکوں۔

انسانیت کو ترجیح دینے والی رینا کہتی ہیں دو ملک بننے تھے بن گئے لیکن تقسیم کے وقت جو خون خرابہ ہوا، اس سے دل دکھتا ہے، جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہمیں یہ سب بھول کر انسانیت کے دھرم کو آگے رکھنا چاہیے۔

ہم نے وہ خون خرابہ دنگے فساد اپنی آنکھوں سے دیکھے لیکن ہمارے دلوں میں پھر بھی نفرت نہیں پھر یہ آج کل کے بچے جنہوں نے تقسیم کا زخم براہ راست نہیں سہا ان کے اندر ایک دوسرے سے اتنی نفرت کیوں ہے؟ اپنے اپنے مذہب پر سختی سے عمل کیجیے لیکن اگر ہم ایک دوسرے کے مذہب کا بھی احترام کرنے لگیں تو سب اچھا ہو جائے گا جو ماضی میں ہو چکا اسے بھول کر آگے بڑھنا چاہیے۔ دونوں ملک ایک نہیں ہو سکتے لیکن اچھے پڑوسیوں کی طرح رہنا تو سیکھ سکتے ہیں۔

اُردو افسانہ ایک معصوم خواہش

زمانہ اپنی بساط پر ہر انسان کے لئے حالات کے الگ الگ مہرے چلتا ہے۔ پہلے میں جب گھر آتا تو گھر کاٹنے کو دوڑتا تھا تنہائی کا احساس دل میں کانٹے چبھوتا رہتا۔ گھر سے باہر رہنے کی ترجیح میں ہی قرار رہتا۔ اب حالات یکسر بدل گئے ہیں۔ حالات کی بساط پر مہرے گھر آنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔... گھر میں داخل ہوتے ہی حالات اپنی مسرت کی پوٹلی کھول دیتا ہے۔ بیوی کا مسکراتا ہوا چہرا، بچوں کی معصومانہ پکار "بابا آئے... بابا آ گئے! یہ سنکر دن بھر کی تکان اتر جاتی۔

شہناز کا میری زندگی میں آتے ہی یہ راز کھلا کہ گھر کیا ہوتا ہے اور سکون کسے کہتے ہیں۔ صاف ستھرا گھر، بچوں کی شرارتیں، معصوم سوال، مہمانوں کا آنا، گھومنا پھرنا۔ زندگی کی بساط پر خوشیوں کے گھوڑے کی ڈھائی چال نے میری زندگی کی کایا ہی پلٹ دی۔

یہ سب اللہ کا کرم ہی تو ہے۔

میں بستر پر لیٹا زندگی میں در آئی نئی خوشبوؤں سے معطر زندگی سے لپٹی خوشی اور سکون کے منبع شہناز کا منتظر ہوں۔... میں نے آواز لگائی... شہناز، شہناز!

اللہ جانے میری آواز وہ سن بھی پا رہی ہے۔ اف!

تمام کام نپٹا کر کب آئیگی۔ مجھے تو اب نیند آنے لگی ہے۔

اتنا شور کیوں مچا رہے ہیں۔ بچوں کو سلانا مشکل ہو جاتا ہے۔ آہستہ سے دروازہ بند کر کے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے شہناز نے کہا۔ شکر ہے تم آ گئی۔ کل سے مجھے اسکول کے بچوں کا جو نیا کام ملا ہے اس کے لئے صبح جلد اٹھنا ہوگا۔ کل سے سب کام تم جلدی کر لیا کرو۔ تو آپ سو جاتے۔ شہناز نے تیکھی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا "جب تک تم نہ سلاؤ ہم کہاں سونے والے ہیں"۔ میرے خمار بھرے نظر و انداز کلام کے جواب میں شہناز بے اختیار مسکرا کر نظریں چرانے لگی۔ "شہناز وہ عطر کی شیشی کہاں ہے"؟... میں نے استفسار کیا "صبو وہ تم میرے لئے لائے ہو نا تو میں چاہتی ہوں وہ میں اپنی سکھی سہیلیوں سے ملنے جاؤں تب استعمال کروں۔ اسے میں نے تم سے چھپا کر رکھ لیا ہے" "شہناز وہ عطر میں نے تمہاری سہیلیوں کے لئے نہیں بلکہ میں چاہتا ہوں تم میرے لئے اسے استعمال کرو۔ پروفیسر صاحب کی بہو جب بھی اس مخصوص خوشبو کا استعمال کرتی ہیں تو سوچتا ہوں کہ تم بھی ایسی ہی خوشبو لگا کر میرے لئے مہکا کرو۔ زندگی میں پہلی بار اتنی قیمتی چیز اسی شوق کے لئے خریدی ہے۔ دو ماہ کی آمدنی کے برابر رقم خرچ کی ہے تب جا کر خرید سکا ہوں۔ ابھی تک اس کے لئے ایڈوانس لیے پیسے ادا نہیں ہوئے۔ بتاؤ شہناز کہاں رکھا ہے۔ میں نے زور دیکر پوچھا۔ صبو آپ یوں سارا سامان کپڑے یوں اتھل پتھل نہ کریں میں دیتی ہوں۔ رکیں، ذرا ٹھہریں... کپڑے کو الٹ پلٹ کرتے عطر کی شیشی چٹاک سے میرے سامنے ٹوٹ کر بکھر گئی۔ میں بے اختیار پیشانی پر ہاتھ مار کر تاسف سے شہناز کی آواز پر پلٹ کر اسے دیکھنے لگا... میں کہہ رہی تھی نا ٹھہرنے کے لئے تم نے کپڑوں کے ساتھ نیچے رکھی شیشی توڑ دی صبو! آہ یہ کیا کر دیا؟... میری وجہ سے نہیں تمہارے چھپانے کی وجہ سے نقصان ہوا ہے۔ ارے واہ یہ سینہ زوری بھی خوب ہے۔... اگر تمہیں ایک وقت میں میری بات سمجھ نہیں آتی تو تم جا سکتی ہو۔ وہ میری بات سنکر رونے لگی۔

اب اگر ذرا بھی رونے کا ڈرامہ کیا تو ابھی تمہیں میکے چھوڑ آؤں گا۔ میں نے غصیلے لہجے میں روکھائی سے جواب دیا۔... "چلو ہٹو مجھے مت چھوؤ۔ مجھے نیند آ رہی ہے"۔

دن بھر کی تکان اور نرم لحاف کے گداز پن نے مجھ پر غنودگی طاری کر دی۔ کب نیند کی آغوش میں چلا گیا خبر ہی نہ ہوئی۔ صبح ناشتہ تیار تھا۔ آنکھوں کے کٹورے میں سرخ ڈوروں کے ساتھ قریب ہی شہناز بیٹھی تھی مگر میں بنا ناشتہ کئے چپ چاپ کام پر نکل گیا۔

میری تمام محرومیاں، جھڑکیاں، میری آنکھوں کے راستے رواں تھیں۔

آج اماں مجھے بہت یاد آ رہی تھی۔ اس وسیع و عریض دنیا میں انکے سوا میرا کوئی نہیں تھا۔ پوچھنے پر بھی اماں نے کسی کے بارے میں نہیں بتایا بس اتنا کہتی تھی کہ تیرا باپ اچھا آدمی تھا جوانی میں حادثہ کا شکار ہو گیا سوائے دو کمروں والے گھر کے اس نے ہمارے لئے کچھ نہیں چھوڑا میں آج بھی اسی گھر میں رہتا ہوں اماں کے دنیا سے رخصت ہونے والا دن قیامت سے کم نہ تھا۔ اماں کی یاد کے ساتھ ہی اس دن کا درد تازہ ہو جاتا ہے۔ اماں ہی نے مجھے پنکچر کی دکان پر رکھوایا تھا اور خود برسوں سے مولوی صاحب کے گھر کام کرنے جاتی تھی انکی بیگم صاحبہ سے منت سماجت کر کے مجھے قرآن مجید اور پانچویں جماعت تک پڑھوایا تھا۔ اماں نے جانے سے پہلے بیگم صاحبہ سے میرا خیال رکھنے کا وعدہ لے گئی تھی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو آج میں نہ جانے کہاں کی خاک چھان رہا ہوتا۔ وہ میرے لئے سیسہ پلائی دیوار بنی رہیں۔ اماں کے بعد میں ہر ماہ کی تنخواہ اور آتے جاتے پنکچر لگوانے والے لوگوں کی ٹپ اماں کی طرح بیگم صاحبہ کو دے دیتا وہ روز مجھے دونوں وقت کھانا کھلا دیتی۔ پنکچر کی دوکان کے مالک رفیق سیٹھ مجھے سارے پیسے دینے سے منع کرتے مگر میں تو پہلے بھی اماں کو ایسا ہی دیا کرتا تھا۔ اماں مجھے اکثر تاکید کرتی رہتی "صبو تو باہر نہ جانے کیسے لوگوں سے ملتا رہتا ہوگا تجھے میری قسم کوئی بری لت نہ لگا لینا کبھی چائے، پان، سگریٹ نہیں پینا، کبھی گالی نہیں دینا۔ تیرا باپ بہت شریف آدمی تھا۔ بہت زیادہ بھوک لگے تو باہر سے سموسہ وغیرہ کھا لیا کر" پر میں وہ بھی نہیں کھاتا سارے پیسے اماں کے ہاتھ میں رکھ دیتا۔ پیسے لیتے وقت ان کی آنکھیں خلوص سے مہک اٹھتیں جو مجھے بھوک پیاس سے زیادہ عزیز تھی میں اس کی خوشی کے لئے خوب محنت کرتا۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ ان پیسوں میں وہ میرا بہتر مستقبل دیکھ رہی تھی۔ بچپن

سے مولوی صاحب کے گھر اماں کے ساتھ جایا کرتا تو قریب کی دکان سے چھوٹی موٹی چیزیں خرید لانے کو کہتے آج بھی بیگم صاحبہ کچھ منگوانا ہوتا تو فون پر کہہ دیتی ہیں۔سودا سلف لاکر میں ملازمہ کے ہاتھ بھیج دیتا اور اپنی آمدنی کے پیسے مولوی صاحب کے ذریعہ بھیجوا دیتا کیونکہ میرے پندرہ سال مکمل ہونے کے بعد بیگم صاحبہ نے زنانہ خانہ کی طرف کے داخلے پر پابندی لگا دی تھی۔اماں کے جانے کے کچھ عرصہ بعد پہلی بار مجھے بیگم صاحبہ نے گھر میں بلایا تھا وہ پردے کے پیچھے بیٹھی مجھ سے کہہ رہی تھیں۔
دیکھو بیٹا صبور تمہاری ماں کی خواہش تھی کہ وہ تمہیں ایک آٹو رکشہ خرید کر چلانے دیں وہ ایک ایک پیسہ میرے پاس جمع کرتی رہیں ہیں۔مجھے معلوم ہے اسی نے تمہیں بھی اپنی تنخواہ سونپنے کو کہا ہو گا اسی لئے تم مجھے اپنے پیسے دیتے ہو اور اب وقت آ گیا ہے اچھے خاصے پیسے جمع ہو گئے ہیں۔میں امام صاحب کو آٹو کی خریداری کے لئے کہہ چکی ہوں تم اپنا لائسنس بنانے کی تیاری کرو ابھی ستر ہزار کی کمی ہے میں اپنے جاننے والے ایک پروفیسر میاں بیوی سے بات کر لی ہے وہ قرض دینے کو تیار ہیں بشرط کہ انہیں تم روز یونیورسیٹی لے جا کر چھوڑنے کے بعد تمہیں گاڑی گھر پر پہنچانی ہو گی تا کہ انکی ڈاکٹر بہو ہاسپٹل جا سکے پھر تمہیں واپسی پر اسپتال سے گاڑی لیکر یونیورسٹی جانا ہو گا۔ پروفیسر صاحب کو گھر پہنچا کر گاڑی ہاسپٹل میں پارک کرنی ہو گی وہ معقول تنخواہ سے قرض کے پیسوں کی کٹوتی کر دیا کرینگے۔باقی وقت میں کمائے ہوئے آٹو رکشہ کے پیسے بھی ہم قرض میں منہا کرتے جائینگے قرض کی ادائیگی ہوتے ہی تمہیں اختیار ہو گا تم پروفیسر صاحب کی ملازمت کرو یا نہ کرو۔اماں کے علاوہ میں کسی بھی رشتہ سے ناواقف تھا سیٹھ سے رات دن واسطہ رہتا مگر اس نے کبھی مجھے ایک ملازم سے بڑھ کر نہ سمجھا۔ صبو چار نمبر کا پانا دینا صبو وہ پیچ والا اسکریو لادے۔کبھی بڑا تو کبھی چھوٹا اسکریو ڈرائیور بھاگ کر لانے کو کہتے، دیکھ ہوا بھروانے گاڑی آئی ہے جا کر پائپ لگا، اسٹپنی اٹھا کر لا، گاڑی کو سائیڈ بتلا۔بس انہیں میرے کام سے کام رہا- میں بھی اس بھاگ دوڑ سے تھک چکا تھا۔پھر اماں کی خواہش کو میں کیسے رد کرتا۔بیگم صاحبہ کا مشورہ قبول کر لیا ۔ایک سال کے اندر آٹو رکشہ کا قرض ادا ہو گیا۔پروفیسر صاحب کے خلوص اور مہینے کو لگی بندھی آمدنی کی وجہ سے آج تک انکی ڈیوٹی بجا لا رہا ہوں۔

پھر ایک دن مولوی صاحب کے پاس پیسے رکھوانے گیا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ صبور بیٹا تمہاری بیگم صاحبہ نے کہلا بھیجا ہے کہ ”تم کو اب شادی کر لینا چاہئے اگر تم کو کوئی لڑکی پسند ہو تو بتائیں ہم بات کرا آتے ہیں، نہیں تو تم کہو تو وہ خود تلاش کر ینگی“ مولوی صاحب آپ کو معلوم ہے میرا اس دنیا میں کوئی رشتہ دار نہیں، کام کے سوا کبھی کچھ سوچا ہی نہیں۔۔۔۔

مولوی صاحب فرمانے لگے اجی میاں خاندان بنانے کی پہلی سیڑھی شادی ہوتی ہے۔ یہ ہی دنیا کا پہلا رشتہ ہے۔ایسے ہی خاندان بنتے ہیں پھر قبیلہ وجود میں آتا ہے معاشرہ ایسے ہی تو تشکیل پاتا ہے تم شادی کا ارادہ تو کرو، اللہ برکت ڈالے گا۔پھر ایک دن تمہارا بھی خاندان بنے گا ان شاء اللہ میری دعا ہے تم خوب پروان چڑھو۔

اس طرح شہناز میری زندگی میں آئی مولوی صاحب کی دعا قبول ہوئی ہمیں اللہ نے دو پیارے بچوں سے نوازا۔

گرد و نواح سے بے خبر ذہن ماضی کے ادھیڑ بن میں گم آٹو کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ایک پاؤں آٹو رکشہ میں تو دوسرا باہر لٹک رہا تھا۔فون کی گھنٹی سے میری محویت ٹوٹی مولوی صاحب کو یاد کیا اور انہوں نے فون کر کے مجھے بلا لیا۔ چل صبو اماں کے بعد ایک وہی تو میرے خیر خواہ ہیں شاید ان سے مل کر دل کو سکون ملے۔یہ سوچ کر میں ملاقات کے لئے نکل پڑا۔سلام کر کے بہت دیر سے مولوی صاحب کے سامنے بیٹھا ہوں مگر دل کی بے چینی لب تک نہ آ سکی۔۔۔۔مولوی صاحب خود چھیڑ کر میری خیریت دریافت کرنے لگے۔جی سب بہتر ہے۔۔۔۔ آج بڑے خاموش ہو میاں کیا بات ہے؟ تمہارا کام کیسے چل رہا ہے؟۔۔۔الحمدللہ ایک اسکول کے چار بچوں کی راتب ملی ہے۔سوچ رہا ہوں کچھ پیسے جمع ہو جائیں تو آٹو رکشہ بیچ کر ٹیکسی خرید لوں۔

اللہ بہتری عطا کرے مولوی صاحب کی دعا سے قدرے بے چین دل کو قرار آیا۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد مولوی صاحب حسبِ عادت نصیحت فرمانے لگے۔صبور بیٹے ازدواجی زندگی کے لئے میری یہ دو باتیں ہمیشہ یاد رکھنا میاں بیوی ایک دوسرے کی فطری جذبات وضروریات کا خیال رکھنا اور ایک دوسروں کے غلطیوں کو نظر انداز کر دینا، دل سے معاف کر دینا۔ایسا کرنے سے رشتہ برقرار رہتا ہے۔لہذا خاندان کو مضبوط کرنے کا یہ بہت اہم طریقہ ہے۔

مولوی صاحب اپنے جیب سے لفافہ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگے یہ تمہاری بیگم صاحبہ نے کچھ پیسے دیے ہیں۔میں لینے سے انکار کرنے لگا بیگم صاحبہ کے کہنے پر میں بنک اکاؤنٹ میں پیسے رکھنے لگا ہوں مولوی صاحب ناراضگی و اپنایت کے ملے لہجہ میں کہنے لگے تمہیں نہیں چاہیے تو نہ لو، ان پیسوں سے اپنی۔۔۔ بیوی کے لئے کوئی تحفہ خرید لینا۔۔۔۔میں اجازت کے بعد وہاں سے رخصت ہوا۔۔۔۔

گھر کی دہلیز پر دستک دینے پر شہناز کو بجھے بجھے چہرے کملائے ہوئے گلاب پر شبنم شرمندگی کے قطروں کے ساتھ اپنے سامنے پایا۔میں نے مسکرا کر اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیئے، میرے سیدھے ہاتھ میں اپنی پسند کی برانڈ اور دوسرے ہاتھ میں کچھ سستی عطر کی بوتل تھی جو شہناز کے لئے الگ سے خریدی تھی۔شہناز تم اس گھر کی رونق ہو دیکھو تو میں تمہارے لئے ایک کی جگہ دو دو بوتلیں لے آیا ہوں۔اب تم مسکرا بھی دو۔ غلطی تو میری ہی تھی میں مر کر بھی تم سے خفا نہیں ہو سکتی ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں وہ مسکرا کر کہنے لگی۔اس کی مسکراہٹ سے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے من آنگن میں چار سو بہار ہی بہار چھا گئی ہو۔

(منقول)

گلگت میں خاتون صحافی کیلئے
صحافت معرکہ سر کرنے کے برابر

تحریر: شیریں کریم

گلگت بلتستان سے تعلق رکھنے والی خاتون صحافی کرن قاسم پچھلے دس سالوں سے شعبہ صحافت سے وابستہ ہیں، لیکن اب بڑھتی ہوئی مشکلات کے باعث اب وہ صحافت کو چھوڑنے کے بارے میں سوچ رہی ہیں۔

کرن قاسم کے لیے خاتون ہونے کے ناطے ہاتھ میں ٹرائی پوڈ اور مائیک پکڑ کر صحافت کرنا کسی معرکہ کو سر کرنے سے کم نہ تھا۔

گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھتے وقت وہ ہر روز سوچتی ہیں کہ صحافت کو خیرباد کہہ دوں لیکن ایسے اچانک کیسے یہ تو اس کا گذشتہ دس سالوں پہ محیط کیریئر ہے جو کہ کئی نشیب وفراز سے گزرا ہے۔

گلگت بلتستان سے تعلق رکھنے والی خاتون صحافی کرن قاسم پچھلے دس سالوں سے شعبہ صحافت سے وابستہ ہیں، لیکن اب بڑھتی ہوئی مشکلات کے باعث اب وہ صحافت کو چھوڑنے کے حوالے سے کش مکش میں ہیں۔

کرن قاسم نے جب سے صحافت شروع کی معاشرہ اسے تنقید کا نشانہ بناتا آرہا ہے۔ شروع کے دنوں میں انہیں گھر والوں کی جانب سے صرف اس لیے تنقید کا نشانہ بنایا کہ انہوں نے شعبہ صحافت میں قدم کیوں رکھا۔

گلگت بلتسان ایک قدامت پسند معاشرہ ہے جس کی وجہ سے خواتین صحافیوں کو کام کرنے میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

کرن قاسم بتاتی ہیں، 'پوری ایک دہائی اس شعبہ میں گزار دی لیکن مسائل روز بروز بڑھتے چلے جارہے ہیں، معاشرے کی تنگ نظری ایک طرف، اب تو صحافیوں کے مالی حالات دن بہ دن خراب تر ہوتے چلے جارہے ہیں، کیونکہ گھر کے مالی اخراجات کو پورا کرنا بھی ایک ذمہ داری ہے۔'

کرن قاسم چاہتی ہیں کہ وہ شعبہ صحافت کو چھوڑ کر کسی اور شعبے میں کام کریں کیونکہ صحافت میں مزید مشکلات کو برداشت کرنا مشکل تر ہو گیا ہے لیکن ان کا صحافت سے لگاؤ، ایسا کرنے سے روکے ہوئے ہے۔

گلگت بلتستان پریس کلب میں کل 110 صحافی رجسٹرڈ ہیں جن میں سے 24 ارکان مستقل جبکہ چھ رکن ایسوسی ایٹس اور 80 کے قریب اعزازی ارکان ہیں۔ 110 ارکان میں خواتین صحافیوں کی تعداد صرف دو ہے جو کہ عملی صحافت میں اپنا کردار ادا کر رہی ہیں۔ سینئر صحافیوں کا کہنا ہے کہ رواں حکومت کے برسر اقتدار آنے کے بعد سے میڈیا انڈسٹری مالی مشکلات کا شکار ہے جبکہ صحافیوں کی مالی مشکلات کی ایک وجہ گلگت میں بڑے چینلز کے بیورو آفس کا نہ ہونا بھی ہے۔ اسی ضِمن میں خواتین صحافیوں کی مشکلات اور بھی بڑھ جاتی ہیں کیونکہ معاشرے میں انہیں تنگ نظری سے دیکھا جاتا ہے۔ گلگت بلتستان کے صحافیوں کو انفرمیشن کی رسائی حاصل نہ ہونا، دور رکھتی ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ 'صحافیوں کو معقول ماہانہ تنخواہ نہ دینے سمیت، ہیلتھ انشورنس اور جاب پروٹیکشن کا نہ ہونا اہم مسائل ہیں، تو ان حالات میں خواتین صحافیوں کا گھروں سے نکل کر کام کرنا ایک مشکل کام ہے، فیلڈ میں تنخواہیں نہیں ملتیں، اگر ملتی بھی ہیں تو بہت ہی کم۔'

ایسے حالات میں جامعات سے فارغ التحصیل میڈیا اینڈ کمیونیکیشن کے طلبہ عملی صحافت میں قدم نہیں رکھتے۔ قراقرم انٹرنیشنل یونیورسٹی میڈیا اینڈ کمیونیکیشن کے فیکلٹی ممبر ولیم عباس کے مطابق یونیورسٹی سے ہر سال 10 کے قریب خواتین پاس آؤٹ ہوتی ہیں لیکن عملی طور پر اس شعبے سے وابستہ نہیں ہوتیں۔

گلگت میں صحافت کے شعبے میں کم دستیاب وسائل کے باعث اکثر میڈیا اینڈ کمیونیکیشن کے طلبہ عملی صحافت میں قدم نہیں رکھتے۔ میڈیا انڈسٹری کی عدم توجہ سے گلگت میں باقاعدہ اتنے نیوز چینلز کے بیورو نہیں جہاں صحافت میں روزگار کے مواقع پیدا ہوسکیں۔ میڈیا اینڈ کمیونیکیشن میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کرنے والی صائمہ اب ایک نجی سکول میں بطور استانی فرائض سرانجام دے رہی ہیں۔ معاشرے کی تنگ نظری اور گھر والوں کی طرف سے عائد کردہ پابندی کے باعث وہ عملی طور پہ شعبہ صحافت کا چناؤ نہیں کر پائیں۔

وہ بتاتی ہیں کہ 'صحافت میں آنے والی خواتین کو لوگ اچھا نہیں سمجھتے اور صحافیوں کو معقول تنخواہ بھی نہیں دی جاتی، میں بطور استانی اچھا کماتے ہوئے گھر کے اخراجات پورے کر رہی ہوں جبکہ تعلیم حاصل کرنے کی وجہ بھی یہ ہے کہ پڑھ لکھ کر گھر والوں کی مالی معاونت کی جائے۔' جہاں میڈیا بحران کا شکار ہے وہیں اس دور میں گلگت سمیت ملک بھر میں صحافی سماجی رابطوں کی ویب سائٹ سے صحافت کا آغاز کرتے دکھائی دے رہے ہیں، تاہم ڈیجیٹل میڈیا سے صحافیوں کے لیے آمدن کا حصول کافی مشکل ہے، کیونکہ پاکستان میں ڈیجیٹل میڈیا کو اشتہارات کے اجرا کے حوالے سے کوئی پالیسی مرتب نہیں کی جا سکی۔ سحرش کنول قراقرم انٹرنیشنل یونیورسٹی کے میڈیا ڈیپارٹمنٹ میں زیرِ تعلیم ہیں اور ساتھ میں یوٹیوب چینل بھی چلا رہی ہیں تاہم کہتی ہیں کہ یوٹیوب سے پیسے کمانا آسان کام نہیں۔

سحرش کا کہنا ہے کہ 'فیلڈ میں جا کر کام کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ وہاں معقول تنخواہ نہیں ملتی اور خواتین کے لیے گلگت میں ٹرانسپورٹ کا بڑا مسئلہ ہے جس کی وجہ سے فیلڈ میں اکیلے جاتے ہوئے کسی بھی خاتون کو دس بار سوچنا پڑتا ہے کہ وہ کام کرنے کے لیے جاری تو کسی کو اپنے ساتھ لایا جائے اور کس طرح جائے اور کس طریقے سے کام جاری رکھا جا سکے۔' سحرش کی طرح سیما بھی سوشل میڈیا کے ذریعے سے صحافت کر رہی ہیں۔ صحافت کرتے وقت جہاں دیگر خواتین کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہیں سیما کو درپیش مشکلات بھی کچھ ایک سی ہیں۔

سیما کو خبریں دینے کی وجہ سے متعدد مرتبہ دھمکی آمیز فون کالز موصول ہو چکی ہیں، اور انہیں ویب سائٹ سے خبریں ہٹانے کے لیے دباؤ کا سامنا کرنا پڑا۔

سیما بتاتی ہیں کہ 'میری لگائی ہوئی خبروں کی وجہ سے کافی مرتبہ میرے والد کو فون کالز آئیں کہ وہ اپنی بیٹی کو سمجھائیں اور ہمارے خلاف خبریں چلانے سے گریز کریں، اور ویب سائٹ سے خبریں ڈیلیٹ کریں۔'

صرف خواتین ہی نہیں، مرد صحافیوں کو بھی مشکلات کا سامنا ہے۔ گذشتہ تین برسوں میں میڈیا انڈسٹری شدید مالی بحران کا شکار رہی جس کی وجہ سے ایک طرف اکثر صحافیوں کو جبری طور پہ برطرف کیا جبکہ دوسری جانب صحافیوں کی تنخواہوں میں کمی بھی دیکھنے کو ملی۔ بڑے اداروں نے ڈاؤن سائزنگ کرتے ہوئے صحافیوں کو نوکریوں سے برطرف کیا جس کی وجہ سے نوجوان صحافی صحافت کے مستقبل کے حوالے سے پریشان ہیں۔ 'میڈیا فیلڈ بحران کا شکار ہے جس کی وجہ ملازمین کو وقت پہ تنخواہیں فراہم کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے، اخبارات کو اشتہارات کی ادائیگی نہیں ہوتی جس کی وجہ سے اخبار مالکان سمیت ورکرز کو بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔'

خواتین صحافیوں کے لیے کوٹا سسٹم؟

'میڈیا میں خواتین کی کمی کے حوالے کو دور کیا جا سکتا ہے اگر صحافتی ادارے خواتین کے لیے کوٹا سسٹم مختص کر دیں۔' یہ کہنا ہے کرن قاسم کا جنہوں نے خیال ظاہر کیا کہ 'آج سے دس سال پہلے گلگت میں خواتین کا صحافت کے پیشے سے وابستہ ہونا جہاں غیر معمولی بات تھی، وہیں معاشرے کی جانب سے تنگ نظری کا سامنا کرنا پڑا، حتیٰ کہ دفتر میں بھی مردوں کی جانب سے عجیب رویے اور تنگ نظری سے دیکھا گیا۔'

کرن قاسم کے گھر والوں تک کو شکایت کی گئی کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ خاتون مردوں کے ساتھ بیٹھ کر کام کرے، جیسا کہ وہ کوئی جرم کر رہی ہو۔

لیکن کرن قاسم نے رفتہ رفتہ لوگوں کے رویوں کو بدلتے دیکھا اکثر جو لوگ کرن پہ تنقید کیا کرتے تھے وہ آج اپنے مسائل کو اجاگر کرنے کے لیے ان سے رابطہ کرتے ہیں۔

❁❁❁

ماں کی مصروفیت

ایک ماں لکھتی ہیں!...وہ بھی کیا دن تھے جب میرا گھر ہنسی مذاق اور لڑائی جھگڑے کی آوازوں سے گونجتا تھا۔ ہر طرف بکھری ہوئی چیزیں۔۔۔ بستر پر پینسلوں اور کتابوں کا ڈھیر۔۔۔ پورے کمرے میں پھیلے ہوئے کپڑے۔ میرا پورا دن ان کو کمرہ صاف کرنے اور چیزیں سلیقے سے رکھنے کے لیے ڈانٹنے میں گزرتا۔ صبح کے وقت ایک جاگتے ہی کہتا: ماما مجھے ایک کتاب نہیں مل رہی۔ دوسرا چیختا: میرے جوتے کہاں ہیں؟ ایک منمناتا: ماما میری ہوم ورک والی ڈائری!... اور دوسرا رندھی آواز میں کہتا: ماما میں اپنا ہوم ورک کرنا بھول گیا... ہر کوئی اپنا رونا رو رہا ہوتا۔ اور میں چیختی کہ آپ کی چیزوں کا خیال رکھنا میری ذمہ داری نہیں۔۔۔ اب آپ بڑے ہو گئے ہو، خود سنبھالو!

آج میں ان کے کمرے کے دروازے پر کھڑی ہوں۔ بستر خالی ہیں۔ الماریوں میں صرف چند کپڑے ہیں۔ جو چیز باقی ہے وہ ہے ان کی خوشبو۔ اور میں ان کی خوشبو محسوس کر کے اپنے خالی دل کو بھرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اب صرف ان کے قہقہوں، جھگڑوں اور میرے گلے لگنے کی یاد ہے۔ آج میرا گھر صاف ہے۔ سب کچھ اپنی جگہ پر ہے۔ یہ پرسکون، پرامن اور خاموش ہے۔۔۔ زندگی سے خالی ایک صحرا کی طرح۔ وہ ان کا دروازے کھلے چھوڑ کر بھاگ جانا اور میرا چیختے رہنا کہ دروازے بند کرو۔ آج سب دروازے بند ہیں اور انہیں کھلا چھوڑ جانے والا کوئی نہیں۔

ایک کسی دوسرے شہر چلا گیا ہے اور دوسرا کسی دوسرے ملک۔ دونوں زندگی میں اپنا راستہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ ہر بار وہ آتے ہیں اور ہمارے ساتھ کچھ دن گزارتے ہیں۔ جاتے ہوئے جب وہ اپنے بیگ کھینچتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے میرا دل بھی ساتھ کھنچ رہا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ کاش میں ان کا یہ بیگ ہوتی تو ان کے ساتھ رہتی۔ لیکن پھر میں دعا کرتی ہوں کہ وہ جہاں رہیں آباد رہیں۔ اگر آپ کے بچے ابھی چھوٹے ہیں تو انہیں انجوائے کریں۔ ان کو گدگدائیں، ان کی معصوم حیرت کو شیئر کریں اور ان کی چھوٹی چھوٹی پریشانیوں کا مداوا کریں۔ گھر گندا ہے، کمرے بکھرے ہیں اور دروازے کھلے ہیں تو رہنے دیں۔ یہ سب بعد میں بھی ٹھیک ہو سکتا ہے۔ لیکن بچوں کے ساتھ یہ وقت آپ کو دوبارہ نہیں ملے گا۔

❁❁❁

کلیوپیٹرا، زلیخا - لگا ہے مصر کا بازار، دیکھو!

تحریر: ڈاکٹر طاہرہ کاظمی

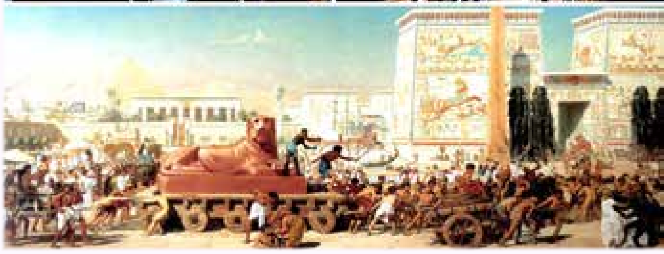

ایسا بہت دفعہ ہوتا ہے کہ ہوا کے دوش پر کہیں بہت دور سے کسی بھولے بسرے گیت کے ٹوٹے پھوٹے بول ہم تک آ پہنچیں تو ہم اپنے آپ کو ایک ایسے گھر میں محسوس کرتے ہیں جہاں کم وبیش چوبیس میں سے اٹھارہ گھنٹے ریڈیو بجتا تھا۔ ہمیں نہیں علم کہ ابا کی ریڈیو سے محبت کی داغ بیل کیسے اور کس عمر میں پڑی؟ لیکن ہم نے ابا اور ریڈیو کو لازم وملزوم دیکھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی وہ اپنے کمرے میں جا کر ریڈیو کا سوئچ گھما دیتے۔ جو کوئی جہاں ہوتا، جان لیتا کہ ابا کی واپسی ہوگئی۔ اب چاہے نور جہاں نغمہ سرا ہوں، یا خبروں کا بلیٹن، صابری برادران کی قوالیاں ہوں یا کوئی مذاکرہ، سب اپنا اپنا کام کرتے رہتے اور پس منظر میں مسلسل کچھ نہ کچھ بجتا رہتا۔

شام کے سرمئی جھٹپٹے میں جب دن بھر کے تھکے ہارے پرندے گھونسلوں کو لوٹ رہے ہوتے، ابا کی پالی ہوئی ڈھیروں چڑیاں بھی چھت پر سے دانا دنکا چگ کر واپس جا رہی ہوتیں، ریڈیو کمرے سے نکل کر برآمدے میں رکھی ہوئی اونچی میز پہ سج جاتا اور پھر نصف شب تک ہمکلام رہتا۔ نہ وہ تھکتا نہ ہم!

مصر کا نام پہلی دفعہ ہم نے ریڈیو پہ ہی سنا، کوئی گلوکارہ اونچے سروں میں گا رہی تھیں، " لگا ہے مصر کا بازار، دیکھو "

ہم جو بازار جانے کے انتہائی شوقین تھے، فوراً اس فکر میں پڑ گئے کہ کہاں ہے یہ بازار جس کا چرچا اتنے ذوق وشوق سے ہو رہا ہے۔

لیکن ارمانوں پہ فوراً ہی اوس پڑ گئی جب علم ہوا کہ مصر کا بازار پہنچ سے بہت دور ہے۔

خیر اس فہرست میں مصر کا نام ہم نے فوراً لکھ لیا جو چپکے چپکے دل میں بنتی رہتی تھی۔

اگر آپ نے مصر کے بازار کی جھلک دیکھنی ہو تو انگلش پیشینٹ نامی فلم دیکھ لیجیے۔ ایک سین میں گھائل ہیرو صاحب حسین وجمیل ہیروئن کے تعاقب میں قاہرہ کے بازار میں گھومتے ہیں اور ہیروئن کو دیکھتے ہی یوں ظاہر کرتے ہیں کہ کیا ہی حسین اتفاق ہے؟ اس گھسے پٹے سین سے قطع نظر کمال کی فلم ہے، ہم تو دیکھتے نہیں تھکتے۔

خیر ہم بات کر رہے تھے مصر کی، تو مصر سے دوسرا تعارف تب ہوا جب ہم سکول کوئز ٹیم کے کپتان بنے اور جنرل نالج کار ٹا لگانا شروع کیا۔ دنیا کے آٹھ عجوبوں میں اہرام مصر کا نام تو آنا ہی تھا بھئی کمال کی جگہ ہوگی یہ بھی، جہاں ایسے ایسے کمالات ان فرعون لوگوں نے دکھا ڈالے، ٹنوں وزنی پتھر اور صحرا میں بنے یہ قد آدم مقبرے۔ لیکن سوچا جائے تو ہزار ہا مجبور غلام ابن غلام کی ہڈیاں سرمہ اور گوشت قیمہ بنا ہوگا۔ اور مزید سوچا جائے تو صدیوں کے اس پھیر میں کہاں یہ کام رکا؟ نہ حاکموں نے عبرت پکڑی اور نہ ہی بھوک کے عفریت نے مجبوروں کو اپنے شکنجے سے رہا کیا۔ برج خلیفہ کی بنیادیں نہ جانے کتنوں کا لہو پی کر کھڑی ہوئی ہیں۔ بیسویں صدی کے جدید اہرام ہی تو ہیں یہ بلند وبالا عمارات!

کوئز کے بعد تقریری مقابلوں کی باری آ گئی۔ اچھا مقرر بنا ہو، سامعین کے دلوں پر زور بیان کی دھاک بٹھانی ہو اور ہر دوسری تقریر میں اقبال کے شعر ہاتھ ہلا ہلا کر نہ پڑھے جائیں، سوچیے ایسا ہو سکتا ہے بھلا؟ اقبال کے شاہین، خودی، مسلم جواں، ماضی کی پرشکوہ حکایتیں و شکایتیں۔ اور۔ اور۔ نیل کے ساحل سے لے کر۔ لیجیے بھڑکا دی نا پھر آتش شوق!

ہمارے محلے میں دس بیبیوں کا معجزہ بہت ذوق وشوق سے پڑھا جاتا تھا۔ اماں تو جاتی ہی تھیں اور ہم بھی اماں کے پلو سے بندھ جاتے۔ لیکن کچھ عرصے بعد ہمیں ساتھ لانے کی تاکید ہر گھر سے ہونے لگی جب ہماری بلند آواز سے فر فر دو پڑھنے کے جوہر کھلے، کیا کیجیے کہ قصہ گوئی کا شوق ان دنوں بھی پال رکھا تھا۔ ہم پہنچتے اور عقیدت و احترام سے دس بیبیوں کی کہانی کہتے۔ ان بیبیوں میں حضرت آسیہ بھی ہوتیں جنھوں نے موسیٰ کو فرعون کے گھر رہتے ہوئے اس کی ناک کے نیچے پالا۔

ویسے کیا بی بی تھیں بھئی، وقت کے حاکم سے ٹکر لے کر بیٹھ گئیں۔ عورت ہو تو ایسی، حق کی خاطر باطل سے ٹکرا جانے والی، ہم سوچتے موسیٰ اور نیل کا تعلق ہمیں بہت اسرار بھرا لگتا۔ شاید ماں جیسا، شیر خوار گی میں اپنی لہروں میں سمیٹ کر آسیہ تک پہنچانے والا اور اک عمر بیت جانے کے بعد ایک بار پھر اپنے دامن میں جگہ دے کر فرعون سے محفوظ رکھنے والا۔

اسی زمانے میں قرآن پڑھا اور قصص الانبیاء بھی، لیجیے پہلے برادران یوسف سے آشنائی ہوئی اور پھر زلیخا سے۔ اس وقت تو ان بھائیوں پہ کبھی حیرت ہوتی اور کبھی غصہ آتا کہ کوئی بھائی ہی بھائی کی جان کے درپے؟ بہت بعد میں sibling rivalry کے بارے میں جانا تو یہ قصہ بھی سمجھ میں آ گیا۔ اپنے سے بہتر انسان کو برداشت کرنا

ازحد مشکل ہے، چاہے ایک ماں کی کوکھ سے ہی کیوں نہ جنم لیا ہو۔
اور زلیخا۔ کیا جی دار عورت تھی بھئی! محبت کے لئے نظر کس پہ ٹھہری، عالم میں جو اک انتخاب تھا۔ اور محبت بھی کیسی کہ پھر کچھ اور باقی ہی نہ رہا۔ یوسف پہ پروانہ وار نثار ہوتے ہوئے اپنے آپ کو بھسم کر بیٹھی۔ صدیوں پہلے کی عورت اور ایسا عزم، ایسی مستقل مزاجی ایسی والہانہ محبت کہ ذکر الہامی کتاب میں ہوا۔ ہم نے زلیخا کو ایک مدت اپنی سوچوں کا محور بنائے رکھا اور اس کے بعد ہماری ملاقات اس دوسری عورت سے ہوگئی۔
کتابوں اور فلموں کا چسکا ہوا اور اس بے مثال عورت کے بارے میں ہم کیسے نہ جانتے جس نے سیزر جیسے گھاگ کو تگنی کا ناچ نچا دیا۔ کلیو پیٹرا کو بچپن میں ہم نے الزبتھ ٹیلر کی شکل میں دیکھا اور پرشکوہ حسن و جمال دل پہ مجسم نقش ہو گیا۔
تخت و تاج کی مطلق العنان مالک، نہ رعب و دبدبے میں کوئی کمی نہ فیصلہ سازی میں، حسن ایسا کہ بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو جائے۔ زمانہ سازایسی کہ ہاری ہوئی بازی پلٹ کر رکھ دے۔ کیا چشم فلک نے ایسی شاندار عورتیں بھی دیکھیں اس زمین پر؟ ہم نے سوچا۔ کیا ہی ہوتا اگر ہم بھی اس زمانے میں ہوتے۔ آج عورت کی بے کسی پہ جتنا جی کڑھتا ہے، اس سے تو بچ گئے ہوتے۔
مصر کو کتابوں کہانیوں اور فلموں کے حوالے سے ہم اس وقت جانتے رہے جب تک ہم تبوک نہ پہنچ گئے۔ تبوک کے ملٹری ہسپتال میں ہمیں مصری ڈاکٹروں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ گوری چٹی، نک سک سے درست، میک اپ اور جدید مغربی ملبوسات، ہاتھوں کے اشاروں، کاجل لگی آنکھوں کے بدلتے زاویوں اور زبان کی تیز دھار سے بیک وقت پشتوں کے پشتے لگاتی خواتین۔ (بقول ہماری اماں کے، وارے نہ آنڑ والیاں) ۔ واللہ ہمیں کلیو پیٹرا اور اس کے ناز و انداز کچھ زیادہ سمجھ میں آنے لگے۔
مصری مرد و عورتیں باتیں کرنے کے شوقین، کم تو ہم بھی نہیں تھے سو قصے کہانیوں سے نہ وہ بیزار ہوتے نہ ہم۔ سیاست کے داؤ پیچ البتہ ہمارے کافی کمزور تھے کہ گوجرانوالہ کی مٹی کا فرعونوں سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں تھا اور ہمارے مصری ساتھی تو بات بات میں فرعونی دانش کا نہ صرف حوالہ دیتے بلکہ ان سے تعلق داری پہ علی الاعلان فخر بھی کرتے۔ ہمیں مصری سٹائل میں دھوبی پٹڑے تو کافی پڑے لیکن اس سے ہمارے مصر جانے کے شوق میں کوئی کمی نہ آئی۔
انہی دنوں ہمیں علم ہوا کہ بحیرہ احمر سے بذریعہ کشتی تبوک سے مصر با آسانی پہنچا جا سکتا ہے۔ رگ سیاحت ابھی پھڑک ہی رہی تھی کہ ایک کشتی ڈوبنے کی خبر آ گئی۔ لیجیے جناب، ہم نے اپنے دیے خود ہی بجھا کے طاق پہ رکھ دیے کہ ابھی زندگی یہ خطرہ مول لینے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔
تبوک قصہ پارینہ بنا اور تبوک میں رہنے والے مصری ساتھی بھی، زندگی کچھ اور راستوں پہ چل پڑی۔ مصر ایک بار پھر سے زندہ ہوا جب ہماری ملاقات مصری انیستھٹ ڈاکٹر ابو اعد سے ہوگئی۔ ہماری قدر مشترک ماضی کا تبوک اور حال میں دوسرے ملکوں میں تعلیم حاصل کرنے والی بیٹیاں تھیں۔ بیٹیاں کیا کر رہی ہیں؟ کیا کرنا چاہتی ہیں؟ یہ باتیں کرتے ہم نہ تھکتے۔ وہ ہمیں اکثر کہتے، آپ آخر کب مصر جائیں گی؟ آپ کو مصر یاد کرتا ہے۔ مصر کی یادوں کا تذکرہ کرنے والے ڈاکٹر ابو اعد خود ایک یاد بن گئے جب وہ کرونا کی بھینٹ چڑھ گئے اور دور دیس میں رہنے والی بیٹیوں نے اپنے باپ کا آخری دیدار فون پہ کیا۔
مصر کا غائبانہ ذکر ادھورا رہے گا اگر ایک مصری مریضہ کا ذکر ہم نہ کریں۔ آپریشن کامیاب ہونے پہ وہ اتنی خوش تھیں کہ بضد ہوگئیں کہ ہم ان کے مہمان بنیں۔ جانے وہ کیسے بھانپ گئیں تھیں کہ موسیقی ہمیں بے خود کرتی ہے چاہے سر تال اجنبی سرزمین سے ہی پھوٹ رہے ہوں۔ وہ شام کبھی نہیں بھولے گی جب ان کے شوہر وائلن پہ پر جوش دھنیں بجاتے ہوئے عربی میں گیت سناتے تھے اور وہ اور بیٹیاں تالیاں پیٹتی تھیں۔
نیویارک کا میٹرو پولیٹن میوزیم ہو، یا ایڈنبرا کا نیشنل میوزیم، فرانس کا لوو ہو، یا بروکلین میوزیم، مصر کے فراعین کی باقیات اور تہذیبی آثار ہر میوزیم کا اثاثہ ہیں۔ میٹرو پولیٹن نے تو ایک مقبرہ عین مین ایک بڑے ہال میں سجا رکھا ہے۔ سنا ہے کہ اس مقبرے کی ایک ایک اینٹ اکھاڑ کر اس پہ نمبر لگایا گیا اور پھر اسی ترتیب سے اسے دی میٹ میں جوڑا گیا۔ اس ہال کی بیرونی دیوار شیشے کی بنی ہے جس کے متعلق کہانیاں مشہور ہیں کہ اس دیوار کے پار سڑک پہ ایک پر تعیش فلیٹ میں رہنے والی جیکولین کینیڈی نے زر خطیر کے عوض میوزیم انتظامیہ کو راضی کیا تھا کہ اس کے فلیٹ سے نظر آنے والی میوزیم کی دیوار شیشے کی رکھی جائے۔
ہمیں علم نہیں کہ اس نے ایسا کیوں چاہا؟ شاید شام ڈھلے اپنے شاہانہ گھر کی کھڑکی میں بیٹھی ہاتھ میں کافی کا پیالہ تھامے قدیم مصر کی اس نشانی کو ٹمٹماتی روشنی میں دیکھنا اسے زمان و مکان سے بے نیاز کرتا ہو؟ یا شاید مقبرے کا فسوں اسے کسی اور دنیا میں لے جاتا ہو؟ یا شاید قدیم مصر کا جادو اس کے دل پہ اثر انداز ہوتے ہوئے یہ احساس بیدار کرتا ہو کہ اگر زندگی کا انجام ایسی نشانی سے وابستہ ہو تو ایسی رومانوی موت سے کیا ڈرنا؟ دیکھیے مصر کی قدیم رومان بھری سرزمین کا خیال ہمیں بھی بھٹکائے دے رہا ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ خواہشات کی وہ پوٹلی جو ہم نے بچپن سے باندھ رکھی ہے، وہ کبھی کبھار اچانک ایسے کھل جاتی ہے کہ ہمیں خود یقین نہیں آتا۔
لیجیے جناب سرزمین مصر پر ہم کچھ دن سرکاری کام کریں گے اور شام کو ان کے تعاقب میں نکلیں گے جنہوں نے دماغ میں کب سے سینڈھ لگا رکھی ہے۔ اہرام مصر، نیل کا ساحل، ابو الہول، اور۔ کیلو پیٹرا۔ اور۔ لگا ہے مصر کا بازار دیکھو۔
ابا کا ریڈیو زور زور سے بج رہا ہے۔
❀❀❀

راجہ گدھ کا فکری پہلو

تحریر: آمنہ امین

بانو قدسیہ کو اردو ادب میں خاص مقام حاصل ہے۔ وہ ناول نگار ہونے کے علاوہ افسانہ نگار بھی تھیں۔ ناولوں میں بازگشت، موم کی گڑیا اور راجہ گدھ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ادبی زندگی کا آغاز ناولٹ سے کیا۔ راجہ گدھ بطور خاص آپ کی پہچان بنا۔ آپ مشہور افسانہ نویس اشفاق احمد کی زوجہ بھی ہیں۔

ناول کے بارے میں کہا جاتا ہے یہ زندگی کی روشن کتاب ہے۔ ایک ایسا ارتعاش ہے۔ جو انسان کے اندر گردش پیدا کرتا ہے۔ اک ایسی چیز ہے جو شاعری، فلسفے یا کسی اور کتابی ارتعاش کے بس کی بات نہیں۔ راجہ گدھ بھی اسی سلسلے کی ایک اہم ترین کڑی ہے۔ یہ معاشرے کا عکس ہے۔ معاشرے میں پھیلنے والی برائیوں اور بے راہ رویوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ یہ ناول انیس سو اکاسی میں شائع ہوا اور ایک عرصے تک متنازع بنا رہا اس کی ایک وجہ وہ کڑوا گھونٹ ہے جسے میں اور آپ پینے سے کتراتے ہیں۔ بانو صاحبہ نے اس میں معاشرے کی تلخ حقیقت بیان کی ہے۔ حقیقت کا سامنا کرنا ایک مشکل امر ہے۔ جب یہ ناول شائع ہوا تو اس پر اشفاق احمد کی یہ تحریر درج تھی۔

”راجہ گدھ اردو زبان میں ایک اور طرح کا ناول ہے جو آئندہ لکھنے والوں کے لئے سوچ کی نئی راہیں کھولے گا“

بانو صاحبہ نے ایک مخصوص نفسیاتی فلسفہ مختلف کرداروں کے ذریعہ پیش کیا۔ ان کے مطابق ہماری زندگی بہترین المیہ ہے۔ جب انسان اپنے بنیادی اقدار سے منہ موڑتا ہے۔ اخلاقی ہولناکیوں بے مقصدیت اور بے سمت گڑھے میں جا گرتا ہے۔ انھوں نے اس خاص نقطے کو مختلف کرداروں اور واقعات کے ذریعے پیش کیا انھوں نے روحانیت اور تصوف کے ذریعے اپنے نظریات کا پرچار کیا۔ انھوں نے اپنے آپ کو اسلامی فلسفے تک محدود نہ رکھا بلکہ تبت کے فلسفے کو بھی ہوا دی۔

اس کے علاوہ نروان اور گیان کے مطلق مثالیں دیں۔ فنا اور بقا کی مثالوں کو بھی بڑے منطقی انداز میں پیش کیا ناول کا بنیادی نقطہ رزق حرام کھانا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جب انسان گدھ جاتی کی طرح حرام کھانے لگتا ہے تو اس میں دیوانہ پن پیدا ہو جاتا ہے اس میں انھوں نے انسانوں اور گدھ کی مشترکہ خصوصیات کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے بوڑھے گدھ کو استعاراتی طور پر پیش کیا ہے۔ دورِ حاضر میں حرام اس قدر فروغ پا رہا ہے کہ اس نے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

اس حرام نے انسان کے اندر کی ہوس بڑھا دی ہے وہ مذہبی۔ و اخلاقی ہر طرح کی حدود وقیود سے آزاد ہے۔ مصنفہ نے اپنے مخصوص لب و لہجے کو تمثیلی پیرائے میں بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے اور انسان کے رزق حرام کو ہابیل و قابیل کے واقعے کے ذریعے ہمارے سامنے رکھا۔ جب انسان گدھ کی طرح مردار کھانے لگتا ہے تو وہ چوری رشوت اور زنا جیسے جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔ رزق حرام بہروپیے کا روپ دھار کر حرام خانے کی ترغیب دیتا ہے۔

اس سلسلے میں فرزانہ نیلم کہتی ہیں کہ مغرب کی آزاد روی اور اس کے حلال و حرام کے تصور سے نا آشنا ہونا ہے۔

جس کی تقلید اہل مشرق تیزی سے کر رہے ہیں۔ اس پر بہت سے سوالات اٹھائے گئے اور اس لاحاصل کو مثبت و منفی دونوں معنوں میں ابھارنے کی کوشش کی گئی۔ اس لاحاصل کو وہ دیوانگی سے تعبیر کرتی ہیں۔ اگر عشق لاحاصل سچا جذبہ ہو تو انسان دنیا کی بلند ترین چوٹیوں کو چھو سکتا ہے۔ ناول میں اس کی مثال چوٹیوں کو سر کرنے اور فرہاد کی دودھ کی نہر نکالنے سے دی گئی ہے۔ شرط یہ ہے کہ انسان کا قوت ارادی آہنی دیوار کی طرح ہو۔ اگر عشق لاحاصل کو منفی پہلو سے دیکھا جائے تو اس کا جواب سیمی شاہ کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے جو آفتاب کے عشق میں مبتلا ہے۔

اس کردار کے ذریعے بانو نے انسانی نفسیات کو لکھا۔ انسان خود پسند اور خود غرض واقع ہوا ہے اپنی ہار برداشت نہیں کر سکتا اور یہ سب کچھ سیمی کے ساتھ ہوا وہ عشق لاحاصل کی وجہ سے پاگل پن کا شکار ہوئی اور حرام موت کی مرتکب ہوئی۔ عشق لاحاصل نے اسے طبعی موت مرنے پر مجبور کیا۔ طبعی موت کی معراج خودکشی اور دیوانہ پن ہے۔

اس طرح زنا بھی رزق حرام کی اہم کڑی ہے۔ اس ضمن میں ایک اور اہم کردار قیوم کا ہے جو ذہنی جذباتی اور روحانی اضطراب کا شکار ہے۔ جو بظاہر تو سیدھا سادہ ہے۔ لیکن اتنا ہوس پرست ہے کہ اس نے سیمی سے نہیں اس کے جسم سے محبت کی اور وہ لقمہ حرام کا مرتکب ہوا۔

پروفیسر سہیل جو قیوم کو جنسی دباؤ سے نکالنے کے حربے بتاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ عابدہ سے تعلقات قائم کرتا ہے۔ تاکہ وہ دیوانے پن سے بچ سکے۔ اس ناول میں جس قسم کے نظریات پیش کیے ان سے پتہ چلتا ہے کہ بانو فرائیڈ سے متاثر تھیں۔ ان کے خیال میں جنسی قوت صرف نسل انسانی بڑھانے تک محدود نہیں بلکہ یہ قوت دنیا اور دین کے بیچ کے سفر کو بھی کم کرنے میں مدد دیتی ہے اگر انسان اس قوت پر عمل درآمد کرے تو عرفان تک پہنچتا ہے اگر ذرا بھی اس کے پائے استقلال میں لرزش ہو تو

دیوانہ بن جاتا ہے اور پاگل کہلاتا ہے۔

دنیا کا عرفان ہو تو موسیقی، مصوری، شاعری بن جاتی ہے یہ قوت ذرا منقبض ہو تو لقمہ حرام بن جاتی ہے۔ امداد نظامی کردار سہیل کے بارے میں کہتے ہیں دانشور مشرقی اقدار روحانیت تصوف اور مذہبی اخلاقیات کا علمدار ہے۔ بلکہ مغرب میں کچھ عرصہ گزار کر وہاں کی مادی ترقی کے پس منظر پھیلے ہوئے کھوکھلے پن، بے سکونی اور خلفشار کا مشاہدہ بھی کر چکا ہے۔ اس کی تھیوری خوف، دہشت اور تنہائی جیسے عوارض اس کے وجود پر ہلا بول دیتے ہیں۔

وہ تنہائی خودکشی اور دیوانے پن کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس پورے ناول میں بانو نے قیوم کو اپنا اور گدھ جاتی کو انسانی برادری کے مماثل قرار دیا ہے جس کا کام مردار کھانا ہے۔ قیوم خارجی دباؤ کم کرنے کے لئے امتل اور عابدہ جیسے کرداروں کا استعمال کرتا ہے۔ ہر شخص کسی خاص فلسفے سے وابستہ ہے۔ راجہ گدھ سوچ کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ ایک سوچ علم کا بلند ترین درجہ اور دوسری سوچ وجدان ایک سوچ وہ ہے جو انسان کو مجنوں کی طرح صحرا میں بھٹکنے پر مجبور کرتی ہے اور اس کا نتیجہ صحرا میں دفن ہونا ہے اور دوسری سوچ انسان کو شعور دیتی ہے۔

اسے آگاہی دیتی ہے۔ پہچان کرواتی ہے۔ بانو نے سہیل کی غلطی کو انسان کی اس پہلی غلطی سے ملایا جو اسے شجرے میں ملی تھی۔ یہ وہ غلطی ہے جو آدم سے ہوئی تھی جو انسانوں کے اندر اپنے پنجے گاڑ چکی ہے۔ یہ ناول فکری ہونے کے ساتھ ساتھ مقصدی بھی ہے۔ دنیا مکافات عمل ہے۔ انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا بھی ہے۔ قیوم نے جس رنگ ڈھنگ سے زندگی گزاری۔ اس رنگ ڈھنگ کی لڑکی باکرہ اس کی زندگی میں آ گئی۔ عابدہ کا کردار غیرت کے ٹھیکیداروں کے منہ پر زوردار طمانچہ ہے۔

ہر قوم کا اپنا نصب العین ہونا چاہیے۔ اس کی ایک مثال روشن ہے۔ یہ ناول پاکستان بننے کے بعد لکھا گیا۔ اس کی بنیاد مادیت پرستی ہے۔ جب یہ ناول لکھا گیا اس وقت جاگیرداروں اور نوابین کی جگہ سرمایہ دار طبقہ ابھرنا شروع ہو گیا تھا۔ مادیت اور ظاہر پرستی میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ناول کے آخری صفحات میں آفتاب کے بیٹے افراہیم کا ذکر ہے۔ اسے بانو نے اہل عرفان بتایا ہے۔ مگر وہ اس کی کوئی ٹھوس دلیل نہیں دے سکیں۔ اور اس کے علاوہ دیوانگی کے بارے میں بھی خاص دلیل موجود نہیں ہے۔ بہر حال ان کے رزق حرام والی تھیوری بڑی مضبوط ہے۔ گدھ پر الزام ہے کہ وہ حرام کھانے کی وجہ سے پاگل پن کا شکار ہو گیا ہے۔ اس لئے اسے جنگل بدر کیا گیا۔ گیدڑ جب گدھ کی وکالت کرتا ہے تو کہتا ہے حرام کھانا اس کی عادت ہے۔ اس سارے فلسفے کو بانو نے بڑی باریکی سے پیش کیا ہے۔ ناول کا بنیادی مقصد عوام کو رزق حلال کی ترغیب دینا ہے۔ یہ ناول پوری انسانیت کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ فکری ناول ہے۔ اس کے اسی رجحان کو دیکھتے ہوئے اسے کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔

❁❁❁

دنیا بھر میں بیویاں اپنے شوہروں سے کم کماتی ہیں

جرمنی اور بھارت میں کی جانے والی ایک عالمی تحقیق کے نتائج سے معلوم ہوا کہ دنیا بھر میں نوکری پیشہ خواتین اپنے شوہروں کے مقابلے کم کماتی ہیں۔ حیران کن طور پر ’نورڈک‘ خطے کے ممالک میں بھی بیویوں کی کمائی اپنے شوہروں سے کم ہے۔ ’نورڈک‘ خطہ یورپی ممالک ’گرین لینڈ، فن لینڈ، ڈنمارک، ناروے، سویڈن اور آئس لینڈ‘ پر مشتمل ہے اور مذکورہ ممالک خواتین کی آمدنی یا انہیں اقتصادی مواقع فراہم کرنے میں دنیا میں سب سے آگے ہیں۔ بھارتی شہر بنگلور کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینیجمنٹ (آئی آئی ایم) کے سینٹر فار پبلک پالیسی اور جرمنی کی گوٹنگھم یونیورسٹی کے سینٹر فار ماڈرن انڈین اسٹڈیز کی جانب سے کی گئی تحقیق سے ثابت ہوا کہ دنیا کے تمام ممالک کے شوہر اپنی بیویوں سے زیادہ پیسے کماتے ہیں۔

تحقیق کے دوران محققین نے یورپ و ایشیا سمیت دیگر خطوں کے 45 ممالک کے ڈیٹا کا جائزہ لیا اور جن شادی شدہ جوڑوں کے ڈیٹا کا جائزہ لیا گیا، ان کی عمریں 18 سے 65 سال کے درمیان تھیں۔ تحقیق کے دوران ماہرین نے 28 لاکھ 50 ہزار گھرانوں کے ڈیٹا کا جائزہ لیا اور تمام ڈیٹا 1974 سے 2016 کے درمیان حاصل کیا گیا تھا۔ ماہرین نے مختلف ممالک سے حاصل کیے گئے ڈیٹا کا تجزیہ کیا، جس سے معلوم ہوا کہ دنیا بھر میں شوہر اپنی بیویوں سے زیادہ کماتے ہیں۔ ڈیٹا کے مطابق اگرچہ گزشتہ 40 سال میں مرد و خواتین کی کمائی کے فرق میں بہتری آئی ہے اور اب خواتین ماضی کے مقابلے میں 20 فیصد زیادہ کماتی ہیں لیکن اس کے باوجود میاں اور بیوی کی کمائی میں فرق ہے۔

ڈیٹا میں خواتین کو مرد حضرات کے برابر تنخواہ دینے والے ممالک فن لینڈ، آئس لینڈ، سویڈن اور ناروے جیسے ممالک کا بھی جائزہ لیا گیا، جس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ ممالک میں بھی بیویاں اپنے شوہروں سے کم کماتی ہیں۔ مذکورہ تحقیق کا حصہ رہنے والی بھارتی پروفیسر ہیما سوامی ناتھن اور پروفیسر دیپک ملگھن نے برطانوی نشریاتی ادارے ’بی بی سی‘ کو بتایا کہ کمائی کے لحاظ سے صنفی تفریق تمام امیر و غریب ممالک میں موجود ہے۔ دونوں ماہرین کے مطابق دنیا کے تمام ممالک میں امیر و متوسط گھرانوں سمیت غریب گھرانوں میں بھی میاں اور بیوی کی کمائی کی تفریق پائی گئی اور حیران کن طور پر فن لینڈ، آئس لینڈ اور ناروے جیسے ممالک کی بیویاں بھی اپنے شوہروں سے کم کماتی ہیں۔

❁❁❁

سات بچوں کی پیدائش

جب ایبٹ آباد کے جناح ہسپتال میں غیر معمولی آپریشن کرنے والی ڈاکٹر حاملہ خاتون کی رپورٹس دیکھ کر چونک اٹھیں۔ 'حمل ٹھہرنے کے بعد ہی ہمیں پتا چل گیا تھا کہ ایک سے زیادہ بچے ہیں۔ جس نجی کلینک سے علاج کروا رہے تھے انھوں نے اہلیہ کی طبیعت زیادہ خراب ہونے پر ہمیں ہسپتال سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا تھا۔' یہ گذشتہ روز صوبہ خیبر پختونخواہ کے شہر ایبٹ آباد میں سات بچوں کے باپ بننے والے خوشی سے چہکتے یار محمد کے الفاظ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ 'ہم لوگ بڑی بے چارگی میں جناح انٹرنیشنل ہسپتال ایبٹ آباد پہنچے تھے جہاں پر اللہ نے ہمیں چار بیٹے اور تین بیٹیاں دی ہیں۔ ہم لوگ بہت خوش ہیں۔'

یار محمد کا تعلق ضلع بٹگرام سے ہے۔ ان کی اہلیہ نے نجی میڈیکل کالج سے منسلک ٹیچنگ ہسپتال جناح انٹرنیشنل میں سات بچوں کو جنم دیا ہے۔ ہسپتال ذرائع کے مطابق تمام نومولود بچوں اور ان کی ماں کی طبیعت مستحکم ہے۔ یار محمد کی ان بچوں سے پہلے بھی دو بچیاں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ 'اب ان بچوں کی پرورش اور تربیت ان کے لیے بالکل بھی مشکل نہیں ہوگی کیونکہ وہ مشترکہ خاندانی نظام میں رہائش پذیر ہیں جہاں پر سب خاندان والے ان کی مدد کریں گے۔'

جب غیر معمولی آپریشن کرنے والی ڈاکٹر بھی چونک اٹھیں

جناح ہسپتال ایبٹ آباد میں ایک پیچیدہ آپریشن کے ذریعے بچوں کی پیدائش میں مدد فراہم کرنے والی گائناکالوجسٹ ڈاکٹر حنا فیاض کے مطابق خاتون پہلی مرتبہ ان کے پاس ہفتے کے روز آئی تھیں۔ وہ کہتی ہیں کہ 'الٹراساؤنڈ اور دیگر رپورٹس میں ہمیں پتا چلا کہ ان کے حمل میں پانچ بچے ہیں۔ حمل کو تقریباً آٹھ ماہ گزر چکے تھے۔' ڈاکٹر حنا فیاض کے مطابق انھوں نے خاتون کی رپورٹس دیکھیں تو وہ چونک اٹھیں۔ 'خاتون کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک بڑھا ہوا تھا۔ ان کا پیٹ بہت زیادہ پھولا ہوا تھا۔ اس سے پہلے زچگی کے دوران ان کے دو بڑے آپریشن ہو چکے تھے۔ 'جہاں پر پہلے ٹانکے لگے تھے وہاں پر ان کو بہت تکلیف ہو رہی تھی خطرہ تھا کہ ٹانکے اور بچہ دانی پھٹ نہ جائیں جس سے خاتون اور ان کے بچوں کی زندگی کو خطرہ ہو سکتا تھا۔' ان کا کہنا تھا کہ 'ہمیں ایک اور خطرہ یہ بھی تھا کہ خاتون کہیں پوسٹ پارٹم ہیمرج کا شکار نہ ہو جائیں یعنی بچے کی پیدائش کے بعد بہت زیادہ خون بہنا شروع نہ ہو جائے۔ خاتون کا بلڈ پریشر پہلے ہی زیادہ تھا۔ اس سے ان کو جھٹکے لگنا بھی شروع ہو سکتے تھے۔' ڈاکٹر حنا فیاض کا کہنا تھا کہ میرا یہ او پی ڈی کا دن تھا۔ 'میں نے اپنی ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ پروفیسر ڈاکٹر روبینہ بشیر سے پورے کیس پر بات کی جس پر انھوں نے خاندان کی رضامندی سے فی الفور آپریشن کرنے کی صلاح دی تھی۔' اتنے بڑے آپریشن کے لیے ہنگامی بنیادوں پر تیاریاں کی گئیں۔ بچوں کے وارڈ کے ماہر ڈاکٹروں کو ایمرجنسی کال دی گئی۔' انھوں نے کہا کہ 'خاندان والوں کے پاس خون کا انتظام بھی نہیں تھا۔ خون کا انتظام بھی ہم نے خود کیا تھا۔ سارے انتظامات میں جناح انٹرنیشنل کا جدید انفراسٹرکچر ہمارے بہت کام آیا تھا۔'

آپریشن کا خطرناک مرحلہ

ڈاکٹر حنا فیاض کا کہنا تھا کہ اس آپریشن میں مجھے میری تین جونیئر ٹی ایم او ڈاکٹر شہیلہ، ڈاکٹر مریم اور ڈاکٹر ربیعہ کے علاوہ ماہر پیرامیڈیکل اور بے ہوشی فراہم کرنے والے ڈاکٹرز نے مدد فراہم کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ 'یہ آپریشن تو ایک گھنٹے پر محیط تھا۔ مگر جب پیٹ کھولا تو آنتیں، بچہ دانی اور پیشاب کی تھیلی جڑے ہوئے تھے۔ مریضہ کا پیٹ پہلے ہی حد سے زیادہ پھولا ہوا تھا جس وجہ سے راستہ بنا کر بچہ دانی تک پہنچنا بھی نازک اور مشکل مرحلہ تھا۔'' جب ایک مرتبہ اس مرحلے میں کامیاب ہو کر ہم بچہ دانی تک پہنچے تو ایک ایک بچے کو ماں سے الگ کرتے جاتے تھے۔ اس میں بھی بہت احتیاط کی ضرورت تھی کہ زیادہ خون نہ بہے۔'

'سات بچوں کا بچ جانا معجزہ ہے'

ان کا کہنا تھا کہ اس سے پہلے میں نے پیدائش کے لیے ایک بڑا آپریشن کیا تھا جس میں تین بچوں کی پیدائش میں مدد فراہم کی تھی۔ 'اس لیے اس میں میرا کچھ تجربہ تھا مگر تین سے زیادہ بچوں کو پیدائش میں مدد فراہم کرنا پہلی مرتبہ تھا۔' ان کا کہنا تھا کہ 'مجھے یہ تجربہ تو تھا کہ اکثر اوقات الٹراساؤنڈ میں بچوں کی صحیح تعداد نہیں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس لیے ہم نے اپنے طور پر چھ بچوں کا ذہن بنا رکھا تھا۔ کٹ وغیرہ بھی چھ بچوں ہی کے لیے تیار کی تھیں۔ مگر جب بچوں کو ماں سے الگ کرنا شروع کیا تو دیکھا کہ یہ تو سات بچے تھے۔ ہسپتال میں کٹ موجود تھی فوری طور پر ساتویں بچے کے لیے بھی کٹ منگوائی گئی۔' ان کا کہنا تھا کہ 'اس وقت میری خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی جب ہم نے ساتویں بچے کو بھی زندہ سلامت پیدائش میں مدد فراہم کر کے وٹامن ڈی فراہم کر دی تھی۔ عموماً ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ پورے کے پورے بچے زندہ سلامت ہوں۔' بچوں کو ہسپتال کی نرسری جبکہ ماں کو آئی سی یو میں منتقل کر دیا گیا ہے جہاں پر بچے اور ماں مستحکم ہیں۔ بچوں کی پیدائش قبل از وقت ہوئی ہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ ان کو کچھ دن نرسری میں رکھنا پڑے۔

'زیادہ بچوں کی پیدائش ادویات کا نتیجہ'

ڈاکٹر حنا فیاض کا کہنا تھا کہ خاتون نے حمل ٹھہرانے والی ادویات کا استعمال کیا تھا۔ 'ادویات استعمال کرنے سے عورت کے جسم میں ایک سے زیادہ انڈے میچور ہو جاتے ہیں، جس کے

نتیجے میں بیک وقت دو یا دو سے زیادہ حمل ہو سکتے ہیں۔‘ان کا کہنا تھا کہ ہماری رائے کے مطابق خاتون کے ایک ساتھ سات بچوں کی پیدائش کی وجہ بھی حمل ٹھہرانے والی ادویات کا استعمال ہے۔’جس وجہ سے اتنے زیادہ حمل ٹھہر گئے تھے۔‘ انھوں نے کہا کہ ’ہمیں خاتون کی ہسٹری سے جو پتا چلا ہے کہ اس کے مطابق 30 کے ابتدائی پیٹے میں موجود خاتون کے تین سال ہو گئے تھے حمل نہیں ٹھہر رہا تھا جس وجہ سے انھوں نے ان ادویات کا استعمال کیا تھا۔‘ ڈاکٹر حنا فیاض کا کہنا تھا کہ اب یہ نہیں پتا کہ انھوں نے یہ ادویات کسی ڈاکٹر کے مشورے سے استعمال کی تھیں یا نہیں۔اگر ماہر ڈاکٹر کے مشورے سے استعمال کی ہوتیں اور مجھ سے کوئی مشورہ کرتا تو میں اس کو ایسی ادویات استعمال کرواتی جن سے ایک سے زیادہ انڈے میچور نہیں ہوتے ہیں۔ان کا کہنا تھا کہ بیک وقت دو یا دو سے زیادہ حمل ٹھہرنے کی آج کل زیادہ تر وجوہات میں ایسی ہی ادویات دی جاتی ہیں۔‘اس لیے خواتین کو چاہیے کہ وہ ایسے معاملات میں بہت زیادہ محتاط رہیں صرف ماہر ڈاکٹر کے مشورے سے ادویات استعمال کریں۔مذکورہ خاتون اور اس کے بچے تو خوش قسمت تھے مگر ہر کوئی اتنا خوش قسمت نہیں ہوتا ہے۔‘ ❁❁❁

99 نعمتوں پر اللہ تعالیٰ شکر ادا کریں

بادشاہ نے اپنے وزیر سے پوچھا یہ میرے نوکر مجھ سے زیادہ کیسے خوش باش پھرتے ہیں؟ جبکہ ان کے پاس کچھ نہیں اور میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے؟وزیر نے کہا:بادشاہ سلامت،اپنے کسی خادم پر قانون نمبر ننانوے کا استعمال کر کے دیکھیئے۔بادشاہ نے پوچھا:... اچھا یہ قانون نمبر ننانوے کیا ہوتا ہے ؟وزیر نے کہا:بادشاہ سلامت،ایک صراحی میں ننانوے درہم ڈال کر، صراحی پر لکھیئے اس میں تمہارے لیئے سو درہم ہدیہ ہے، رات کو کسی خادم کے گھر کے دروازے کے سامنے رکھ کر دروازہ کھٹکھٹا کر ادھر اُدھر چھپ جائیں اور تماشہ دیکھ لیجیئے۔بادشاہ نے یہ تجربہ کرنے کا فیصلہ کیا اور جیسے وزیر نے سمجھایا تھا،ویسے ہی کیا،صراحی رکھنے کے بعد دروازہ کھٹکھٹایا اور چھپ کر تماشہ دیکھنا شروع کر دیا۔دستک سن کر اندر سے خادم نکلا،صراحی اٹھائی اور گھر چلا گیا۔ درہم گنے تو ننانوے نکلے،جبکہ صراحی پر لکھا سو درہم تھا۔ خادم نے سوچا: یقیناً ایک درہم کہیں باہر گرا ہو گا۔ خادم اور اس کے سارے گھر والے باہر نکلے اور درہم کی تلاش شروع کر دی۔ان کی ساری رات اسی تلاش میں گزر گئی۔ خادم کا غصہ اور بے چینی دیکھنے لائق تھی۔اس نے اپنے بیوی بچوں کو سخت سست بھی کہا کیونکہ وہ درہم تلاش کرنے میں ناکام رہے تھے۔کچھ رات صبر اور باقی کی رات بک بک اور جھک جھک میں گزری۔دوسرے دن یہ ملازم محل میں کام کرنے کیلیئے گیا تو اس کا مزاج مکدر، آنکھوں سے جگراتے، کام سے جھنجھلاہٹ، شکل پر افسردگی عیاں تھی۔بادشاہ سمجھ چکا تھا کہ ننانوے کا قانون کیا ہوا کرتا ہے۔لوگ ان 99 نعمتوں کو بھول جاتے ہیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں عطا فرمائی ہوتی ہیں۔اور ساری زندگی اس ایک نعمت کے حصول میں سرگرداں رہ کر گزار دیتے ہیں جو انہیں نہیں ملی ہوتی اور وہ ایک نعمت بھی اللہ کی کسی حکمت کی وجہ سے رُکی ہوئی ہوتی ہے جسے عطا کر دینا اللہ کیلیئے بڑا کام نہیں ہوا کرتا۔

لوگ اپنی اسی ایک مفقود نعمت کیلیئے سرگرداں رہ کر اپنے پاس موجود ننانوے نعمتوں کی لذتوں سے محروم مزاجوں کو مکدر کر کے جیتے ہیں۔حاصل ہو جانے والی ننانوے نعمتوں پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا احسان مانیئے اور ان سے مستفید ہو کر شکر گزار بندے بن کر رہیئے... ❁❁❁

غزل

نورالصباح

زندگی میں خلا نہیں ہو تا
گر وہ ہم سے جدا نہیں ہو تا
ہم نہیں تیرے در سے اٹھیں گے
جب تلک فیصلہ نہیں ہوتا
رت خزاں کی ہے چار سو پھیلی
کوئی پتہ ہرا نہیں ہوتا
ازن مشکل کشا نہ ہو جب تک
کوئی عقدہ کشا نہیں ہوتا
ہم ہدایت کبھی نہ پا سکتے
وہ اگر پیشوا نہیں ہوتا
مجھ کو حاجت نہیں ہے کہنے کی
تجھ سے کچھ بھی چھپا نہیں ہوتا
آپ گر زندگی میں آجاتے
غم کا یہ سلسلہ نہیں ہوتا
در بدر اور بے اماں ہوتے
گر ترا آسرا نہیں ہوتا
رنج میں، کرب میں، اذیت میں
کوئی تیرے سوا نہیں ہوتا
آپ جیسی وفا نہیں اس میں
”صنم آخر خدا نہیں ہوتا “

❁❁❁

منفرد

(بشریٰ سعید عاطف۔مالٹا)

لہجے میں ہے گلاب کی تاثیر منفرد
خاموش لب بھی کرتے ہیں تقریر منفرد
میں نظم و ضبط کی کروں گی داستاں رقم
دے عشق میں تُو درد کی جاگیر منفرد
ظلم و ستم تمہارے لکھے گا قلم مرا
تحریروں میں رہے گی یہ تحریر منفرد
اخلاص سے خمیر ہے گوندھا ہوا مرا
دل کی عمارتوں کی ہے تعمیر منفرد
پرواز ہو گی میرے سخن کی فلک تلک
ہو گی اندھیرے میں سدا تنویر منفرد
سارے زمانے میں نہ ملی ایک بھی مثال
تھی پیکرِ وفا کی تو تصویر منفرد
خوابوں کی اپنے لکھے گی تعبیر اب جدا
اِس دور کے ہے رانجھے کی یہ ہیر منفرد
چاروں طرف سے مجھ پہ برسنے لگی ہے داد
میری ادب میں ہو گئی تشہیر منفرد
پہچان نام سے ترے ہونے لگی صنم
پاؤں میں عشق کی پڑی زنجیر منفرد
کرنے لگے نصیب پہ اپنے تو رشک ہم
زیرِ نقاب دیکھی جو تصویر منفرد
حالات کے بھنور میں نہ پھنستے کبھی بھی ہم
کی ہوتی آپ نے کوئی تدبیر منفرد
ہر گام پر ملے ہیں مجھے راہبر یہاں
ہے ماں کی تو دعا کی یہ تاثیر منفرد
بشریٰ پہ مہرباں رہے میرا خدا سدا
لکھ کاتبِ نصیب تُو تقدیر منفرد

❁❁❁

یاسمین لاری

صرف 50 ہزار روپے میں ماحول دوست گھر بنانے والی پاکستانی ماہر تعمیرات پاکستان میں کیا صرف 50 ہزار روپے میں مکان بنایا جاسکتا ہے؟ یقیناً آپ پکی اینٹوں، سیمنٹ کی بوریوں اور سریے کا تخمینہ لگا کر جواب نفی میں دیں گے۔ لیکن نامور ماہر تعمیرات یاسمین لاری کا دعویٰ ہے کہ دیہی علاقوں میں یہ ماحول دوست مکانات اس سے بھی کم قیمت میں تعمیر ہو سکتے ہیں۔ کراچی کی مرکزی سڑک شارعِ فیصل سے گزرتے ہوئے یقیناً کئی لوگوں کی نظریں گورا قبرستان کے نزدیک سرخ گرینائیٹ سے تعمیر شدہ بلند عمارت پر پڑی ہونگی۔ ایف ٹی سی نامی اس عمارت میں کئی ٹن لوہا، سیمنٹ، شیشہ اور کنکریٹ استعمال ہوا اور یاسمین لاری یہ عمارت تعمیر کرنے والی آرکیٹیکٹ تھیں۔ مگر اب انھوں نے اس مٹیریل کے استعمال کو ترک کر دیا ہے۔

عالمی ایوارڈ یافتہ ماہر تعمیرات یاسمین لاری کا کہنا ہے کہ ہر کوئی ’سٹار آرکیٹیکٹ‘ بننا چاہتا ہے اور خواہش ہوتی ہے کہ بڑی بڑی خوبصورت عمارتیں بنائیں، ان کا بھی وہ ہی حال تھا اور تقریباً 36 سال انھوں نے یہی کیا۔ ’اس وقت دنیا اور تھی۔ کھپت مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ خیال نہیں آیا کہ ہم دنیا کے کولے کے وسائل ختم کرتے جا رہے ہیں۔ اب ہمیں معلوم ہے کہ کیا تباہی آئی ہے۔ ہم نے زمین کو بری طرح سے استعمال کیا ہے۔ قدرتی آفات بڑھ گئی ہیں اور عالمی درجہ حرارت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ گلیشیئر پگھل رہے ہیں جس کی وجہ سے سیلاب آ رہے ہیں۔‘ یاسمین لاری لاہور کے شاہی قلعے کے تحفظ کے لیے اقوامِ متحدہ کے ادارہ برائے سائنس، تعلیم اور ثقافت یونیسکو کی مشیر رہی ہیں۔ اسی دوران 2005 میں کشمیر میں زلزلہ آ گیا اور بقول یاسمین لاری کے یہ زلزلہ ان سمیت کئی لوگوں کی زندگی میں تبدیلی لایا۔ ’میں نے یہ سوچا کہ تعمیرات میں مقامی طریقوں اور زمین کو کیسے استعمال کروں؟ اس میں چونے کا بڑا ہاتھ تھا۔ جو تاریخی عمارتیں ہیں، ان کے تحفظ میں چونے کا استعمال ہوتا ہے۔ وہ میں نے وہاں سے سیکھا اور بعد میں زلزلے سے متاثرہ علاقے میں یہی استعمال کیا۔ اس کی وجہ سے ہمارے گھر بڑے سستے بنتے تھے اور لوگ خود بنا سکتے تھے۔ لکڑی ہو یا پتھر، اس سے ہم نے تعمیرات کیں۔‘

پاکستان میں 2010 اور 2011 میں آنے والے سیلاب اور بعد میں زلزلوں نے یاسمین لاری کو ’کم قیمت‘ مکانات کی تعمیر کا موقع فراہم کیا۔ ’میں نے جو کچھ سیکھا ہے، وہ پرانی قدروں سے سیکھا ہے۔ میں جو بھی ڈیزائن کرتی ہوں وہ ورنیکولر روایات (دیسی طرزِ تعمیر) ہیں یا تاریخی عمارتوں کی مرمت سے سیکھا۔ یاسمین لاری نے سندھ کے ضلع ٹھٹھہ میں مکلی قبرستان کے قریب اپنا ماڈل ولیج بنایا ہے اور ہیریٹیج فاؤنڈیشن نامی تنظیم کے پلیٹ فارم سے زیرو کاربن یا ماحول دوست تعمیرات کے فروغ کے لیے کام کر رہی ہیں۔ ان کی تعمیرات میں مٹی، چونے اور بانس کا استعمال عام ہے۔ ’مٹی ہر جگہ موجود ہے۔ چونا ایک قدیم میٹریل ہے جو اہرامِ مصر، رومن طرز تعمیر اور جو بڑے بڑے قلعے ہیں، ان میں بھی استعمال ہوا۔ 1990 کی دہائی سے چوں کہ سیمنٹ کا دور دورہ شروع ہو گیا اس لیے عام لوگ صرف سیمنٹ کو جانتے ہیں حالانکہ چونے میں سے سب کم کاربن کا اخراج ہوتا ہے اور یہ ہوا سے کاربن کو جذب بھی کرتا ہے۔ مٹی دوبارہ جا کر مٹی میں مل سکتی ہے اور بانس کی فصل ہر دو سال کے بعد مل جاتی ہے۔ لکڑی استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔‘

یاسمین لاری نے پنج گوشہ اور اگلو سٹائل سمیت جیومیٹری کی مختلف اشکال کے گھر بنائے ہیں جو ایک کمرے سے لے کر تین کمروں تک پر مشتمل ہیں، جن کی دیواریں مٹی جبکہ چھت، دروازے، کھڑکیاں اور دروازے بانس سے بنے ہوئے ہیں۔ یاسمین لاری کے مطابق یہ بانس کا پری فیب یا پہلے سے تیار شدہ گھر ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کو ایک ڈھانچہ دیتے ہیں جس کی فنیشنگ وہ خود کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ٹوائلٹ جو بھی بانس سے بنتا ہے اور ہینڈ پمپ جو پانچ لوگ شیئر کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ چولھا بھی ہوتا ہے جس کو ہم نے پاکستان چولھے کا نام دیا ہے، اس کو عالمی ایوارڈ مل چکا ہے۔ ان سب چیزوں کی لاگت تقریباً 27 ہزار روپے بنتی ہے، یہ ہر خاندان کو ملنا چاہیے۔‘ یاسمین لاری کے مطابق یہ گھر گرمی میں ٹھنڈا بھی رہتا ہے جبکہ کنکریٹ بہت زیادہ گرم ہو جاتا ہے۔ ’دیہاتوں میں ماحول مختلف ہے، وہاں ضرورت ہی نہیں ہے کہ کنکریٹ یا سٹیل کا استعمال کریں۔ جو تعمیرات کے پرانے طریقے ہیں، ان میں بہتری لانے کی ضرورت ہے۔ ہم ایسی چیزیں کریں جو غریبوں کے لیے مناسب ہوں۔ ہمیں یہ فکر نہیں کرنی چاہیے کہ یہ امیروں کے لیے اچھی ہیں یا نہیں؟‘

پاکستان میں 2010 اور 2011 کے سیلاب کے بعد ہزاروں گھر تعمیر ہوئے جن کے لیے مقامی اور بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیموں نے متاثرین کی مالی معاونت کی۔ یاسمین لاری کے مطابق ان دنوں جو بڑے بڑے عالمی ادارے مدد کے لیے آئے، انھوں نے جو گھر بنائے وہ ایک سے ڈیڑھ لاکھ روپے تک کی مالیت میں ایک کمرہ بناتے تھے۔ اُن میں پکی اینٹیں، کنکریٹ کے بلاک اور سٹیل کے شہتیر استعمال کیے جاتے تھے۔ ڈیڑھ لاکھ روپے ایک کمرے کے لیے بہت زیادہ ہوتا ہے، اس زمانے میں ہمارے گھر 20 ہزار سے لیکر 30 ہزار روپے میں بن جاتے تھے۔ وزیر اعظم عمران خان نے پاکستان کے مختلف شہروں میں کم آمدنی والے لوگوں کے لیے 50 لاکھ گھر تعمیر کرنے کا اعلان کیا جس کے لیے رجسٹریشن کا بھی آغاز کیا گیا، تاہم کرونا وائرس کے پھیلاؤ کے بعد مزید پیش رفت رک گئی۔

یاسمین لاری کا کہنا ہے کہ ابھی جو سکیم آئی ہے یا پہلے جو آئیں، وہ کبھی بھی غریبوں تک نہیں پہنچ پائیں۔ ’موجودہ سکیم میں بھی ایک کمرہ 15 لاکھ روپے تک کا ہوگا، یہاں تو کئی لوگوں میں اتنی بھی سکت نہیں ہے کہ پانچ ہزار روپے بھی کسی چیز میں ڈال سکیں۔‘ (منقول)

یہ نیلا آسمان کیا ہے؟

آسمان نیلا کیوں ہے؟

نیلا آسمان... مجھے دیکھ کے... مسکراتا ہے... ہم وہ نیلا آسمان... دیکھتے ہیں... جو وہاں... موجود ہی نہیں ہے... اور نگ برلن... اگر آپ بھی اور نگ برلن کی طرح ہمیشہ حیران ہوتے ہیں، کہ آپ وہ "نیلا آسمان کیسے دیکھتے ہیں جو ہے ہی نہیں"

اس پہیلی کو سلجھانے میں انسان کو بہت سی صدیاں لگی ہیں جس میں بہت سارے ذہین لوگوں نے حصہ لیا جن میں ارسطو، آئزک نیوٹن، تھامس ینگ، جیمز کلرک میکسویل اور ہرمین وون، ہیلمولٹز کے نام سرفہرست ہیں.... سورج کی روشنی کے رنگ، ہوائی ذرات، ماحولیاتی مالیکیولز کا حجم اور وہ زاویہ نگاہ جس سے ہم رنگوں کی پہچان کرتے ہیں۔ چلیے ریاضیاتی مساواتوں سے ہٹ کے عام فہم انداز میں رنگوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں طبیعات کی رو سے تمام رنگ، نظر آتی روشنی کی وہ مختلف طول امواج ہیں جو چیزوں سے ٹکرا کے واپس کسی عضوحسی (سینسر) سے ٹکرائے جیسا کہ انسانی آنکھ عضوحسی کا کام سرانجام دیتی ہے۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ روشنی کی طول امواج کا عکس یا پھیلاؤ خود ہی کسی چیز کے ذریعے سے ہو یا کسی بیرونی ذرائع کا حصہ ہوں۔ کسی چیز کے رنگ بدلنے کا انحصار اس بات پر ہے کہ روشنی کے ذرائع سے کون سے رنگ حاصل ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پہ، سرخ جب نیلے رنگ کے نیچے ہوگا تو کالا نظر آئے گا۔

آئزک نیوٹن نے ایک بلوریں منشور کے ساتھ اس تجربے کا عملی مظاہرہ کیا کہ سورج کی سفید روشنی میں ہی دکھائی دیتے سپیکٹرم کے تمام رنگ موجود ہوتے ہیں۔ ایک صاف شفاف دن میں جب ہم اوپر دیکھتے ہیں تو آسمان ہمیں نیلا دکھائی دیتا ہے۔ شام کے وقت، سورج آسمان پر سرخ، گلابی یا سنگترے کے رنگ بکھیرتا ہے۔ لیکن آسمان نیلا کیوں ہے اور ڈوبتا سورج سرخ کیوں دکھائی دیتا ہے۔

ان سوالوں کے جواب کے لیے ہمیں لازمی طور پر روشنی اور زمین کے ماحول کا مشاہدہ کرنا ہوگا۔ کرہ ہوائی بہت سی گیسوں، مالیکیولز اور دوسرے مواد کا مرکب ہے جو زمین کے اطراف پھیلا ہوا ہے۔ ہمارا کرہ ہوائی کا 78 فیصد حصہ نائٹروجن، 21 فیصد آکسیجن پر مشتمل ہے۔

بقیہ حصہ آرگن گیس، پانی (وانپ کی شکل میں، بوندوں اور برف کے گالے) کی حالت میں عام پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ قلیل مقدار میں دیگر گیسیں، سمندر سے نمک کے ذرات، دھول، کاجل، راکھ اور جرگ کے چھوٹے ٹھوس ذرات اڑتے پھرتے ہیں۔

ماحول کی تشکیل کا تعلق محل وقوع، موسم اور بہت سی دوسری چیزوں پر منحصر ہوتا ہے۔ سمندری علاقوں میں آنے والے طوفانوں کی باعث فضا میں پانی کی زیادہ مقدار کا موجود ہونا یا آتش فشانی کے علاقوں میں ہوسکتا ہے کہ فضا میں راکھ کی بہت زیادہ مقدار موجود ہو۔ اس کے علاوہ ماحولیاتی آلودگی کے باعث بھی مختلف گیسیں اور دھول و خاک فضا کا حصہ بنتی رہتی ہیں۔

کرہ ہوائی خلا سے زمین کی درمیانی مقام پر کمزور ہوتا ہے اور آپ جتنا بلندی کی طرف جائیں گے یہ مزید ضخیم سے ضخیم تر ہوتا جائے گا۔ خلا اور کرہ ہوائی کے درمیان کوئی وقفہ موجود نہیں ہے۔ روشنی کی لہریں: روشنی توانائی کی ایک قسم ہے جو موجوں کی صورت میں سفر کرتی ہے۔ توانائی کی اور بھی بہت سی اقسام موجوں کی صورت میں بہتی ہیں۔ مثال کے طور پہ آواز ہوا کی تھرتھراتی موج ہے اور اسی طرح روشنی برقی و مقناطیسی میدان کی تھرتھراتی موجیں ہیں۔

برقی مقناطیسی موجیں: مقناطیسی میدان کی تھرتھراتی موجوں میں سے ایک نسبتاً چھوٹے حصے کو مقناطیسی سپیکٹرم کہا جاتا ہے۔ مقناطیسی موج خلا میں 299,792 کلومیٹر (186,282 میل) فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہیں جسے روشنی کی رفتار کہا جاتا ہے۔ تابکاری میں موجود توانائی روشنی کی طول موج اور تعدد پر منحصر ہے۔ موجوں کے بالاترین سطح سے درمیان تک کا فاصلہ طول موج کہلاتا ہے۔ ہر ایک سیکنڈ میں گزرنے والی موجوں کی تعداد ریڈیو فریکوئینسی کہلاتی ہے۔ روشنی کی طول موج جتنے طویل فاصلے تک جائے گی اس میں توانائی اور تعدد (فریکوئینسی) کا فقدان ہوگا۔

روشنی کے رنگ

ہماری آنکھیں جو روشنی دیکھتی ہیں یہ مقناطیسی سپیکٹرم کا حصہ ہیں۔ سورج سے یا بلب سے آتی روشنی شاید ہمیں سفید دکھائی دے لیکن حقیقت میں یہ روشنی بہت سے رنگوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ہم ان تمام رنگوں کو منشور کے ساتھ الگ الگ کر کے دیکھ سکتے ہیں۔ ہم اس سپیکٹرم کو اس وقت بھی دیکھ سکتے ہیں جب آسمان میں قوس قزح نظر آتی ہے۔ جس میں رنگ ایک دوسرے میں مرکب مسلسل کی صورت گندھے ہوتے ہیں۔ سپیکٹرم کے ایک سرے پر سرخ اور سنگترہ رنگ ہوتے ہیں۔ جب کے پیلا، سبز، نیلا، انڈیگو اور بنفشی رنگ کے مدھم سائے ہوتے ہیں۔ ہر رنگ کی طول موج، تعدد (فریکوئینسی) اور توانائی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے نظر آتے سپیکٹرم میں بنفشی رنگ کی طول موج سب سے کم ہوتی ہے جس کا مطلب ہے کہ اس کی تعدد (فریکوئینسی) اور توانائی سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ سرخ رنگ کی طول موج سب سے زیادہ طویل ہوتی ہے جبکہ تعداد اور توانائی سب سے کم ہوتی ہے۔ خلاء میں روشنی اس وقت تک ایک سیدھی لائن میں سفر کرتی ہے جب تک کوئی چیز اس میں خلل نہ پیدا کر دے روشنی اپنا راستہ نہیں بدلتی ہے۔

جب روشنی کسی فضا یا ماحول میں سفر کرتی ہے تو یہ اس وقت تک سیدھا سفر کرتی ہے جب تک دھول اور گیسوں کے مالیکیولز سے ٹکرا کے پھیل نہ جائے۔

اس کے بعد روشنی کے ساتھ کیا ہوتا ہے یہ اس چیز کی طول موج اور سائز پہ منحصر ہے۔ دھول مٹی اور پانی کے قطروں کے پارٹیکلز روشنی کی طول موج سے بہت بڑے ہوتے ہیں۔ جب روشنی اپنے سے بڑے پارٹیکل سے ٹکراتی ہے تو واپس پلٹتی ہے یا مختلف اطراف میں پھیل جاتی ہے۔ روشنی کے مختلف رنگ بھی ان پارٹیکلوں سے ٹکرا کے مختلف سمتوں میں پھیل جاتے ہیں۔ ہمیں منعکس ہوتی روشنی بھی سفید ہی نظر آئے گی کیوں کہ اس میں پھر بھی تمام رنگ موجود ہوتے ہیں۔

گیسوں کے مالیکیولز، نظر آتی روشنی کی طول موج سے چھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر روشنی ان مالیکیولز کے اندرون پہنچ جائے تو یہ مختلف ردعمل ظاہر کریں گے۔ جب روشنی گیس کے مالیکیول سے ٹکراتی ہے، ان میں سے کچھ روشنی کو جذب کر لیتے ہیں۔ کچھ لمحے میں مالیکیول تابکاری پیدا کرتا ہے اور روشنی کی ایک مختلف سمت میں ترسیل شروع کر دیتا ہے۔

جو رنگ مالیکیول جذب کرے گا صرف اسی رنگ کی ترسیل آگے ہوگی۔ تمام رنگ جذب ہو سکتے ہیں، لیکن نیلا رنگ جو کہ اعلیٰ تعدد (فریکوئینسیز) کا حامل ہے وہ زیادہ جذب ہوتا ہے نسبتاً سرخ کے جو کہ ادنیٰ تعدد کا حامل رنگ ہے۔ یہ رے لی پھیلاؤ عمل کہلاتا ہے، یہ دریافت انگریز طبیعات دان لارڈ جان رے لی سے منسوب ہے جس نے یہ عمل 1870ء میں دریافت کیا تھا۔

تو سوال اب یہ ہے کہ آسمان نیلا کیوں ہے؟

آسمان کا نیلا رنگ اصل میں رے لی عمل پھیلاؤ کا نتیجہ ہے۔ جب روشنی کسی فضا میں داخل ہوتی ہے تو ان میں سے زیادہ تر لمبی طول موج گزر جاتی ہے سرخ، سنگترہ اور پیلا ہوا کے ساتھ اثر انداز ہوتے ہیں۔

سورج کی روشنی جب کرہ ہوائی سے ٹکراتی ہے تو روشنی کی لمبی سرخ لہر اس میں سے گزر جاتی ہے، لیکن نیلی روشنی گیس کے مالیکیولوں سے ٹکرا کر پھیل جاتی ہے یوں آسمان نیلا دکھائی دیتا ہے۔ ڈوبتے سورج کی روشنی کو زیادہ کرہ ہوائی سے گزرنا پڑتا ہے اس لئے روشنی کی چھوٹی لہریں گیسوں سے ٹکرا کے پھیل جاتی ہیں اور صرف سرخ روشنی کی لہر گزرتی ہے اس لئے سورج سرخ نظر آتا ہے۔

مریخ کا آسمان سرخ کیوں ہے؟

1977ء میں وائکنگ نامی مریخ خلائی اسٹیشن سے اور 1997ء میں پاتھ فائنڈر نامی خلائی جہاز تصاویر موصول ہوئیں جس میں مریخ کا ماحولیاتی جائزہ لیا گیا اور یہ دریافت ہوا کہ مریخ کا آسمان سرخ رنگ کا ہے۔

مریخ کا آسمان سرخ رنگ کا اس لئے ہے کیونکہ مریخ کی فضا میں سرخ آئرن کے ذرات وقفے وقفے سے آنے والے طوفانوں کی دھول کے ساتھ اڑتے پھرتے ہیں۔

مریخ کا آسمان موسم کی تبدیلیوں کے ساتھ اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔

مریخ کے آسمان کا رنگ ہلکا نیلا بھی ہوتا ہے جب وہاں کوئی طوفان نہ آیا ہو۔ لیکن دن میں ہماری زمین کی نسبت مریخ کا آسمان ہلکا سیاہ ہوتا ہے، کیوں کہ مریخ کا کرہ ہوائی ہماری زمین کے کرہ ہوائی سے پتلا ہے۔

اب اگر ہم زمین سے اوپر نظر آنے والے کرہ ہوائی میں روشنی کی لہروں کو آسمان سمجھتے ہیں، تو وہ محض روشنی کے رنگوں کا عکس ہے۔ آخری سوال کا جواب آپ دیں کہ ہم آسمان کسے کہتے ہیں اور آسمان کیا چیز ہے جو وہاں موجود ہی نہیں جہاں ہم دیکھتے ہیں۔

❁❁❁

سعودی خواتین کی پرواز اب ہوابازی کے شعبے میں بھی

سعودی خواتین ملک میں حالیہ چند برسوں میں سامنے آنے والے کیریئر کے مواقع کا فائدہ اٹھا کر نئے شعبوں میں اپنی صلاحیتیں آزما رہی ہیں۔ انہی شعبوں میں سے ایک ہوابازی کا بھی ہے۔

’عرب نیوز‘ کے مطابق فلائٹ اٹینڈنٹ انہار تاشقندی نے دو برس قبل سعودی ایئرلائن میں شمولیت اختیار کی تھی۔

انہوں نے بتایا کہ ’ہم نے تربیتی مرحلہ مکمل کیا جس کا بنیادی مقصد مسافروں کے آرام وتحفظ کو یقینی بنانا تھا۔ یہ ملازمت ہمیں مختلف ممالک کی سیر اور وہاں کی تہذیب وثقافت سے سیکھنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔‘

خیال رہے کہ سعودی عرب میں مردوں کے ساتھ ساتھ اب خواتین بھی بطور فلائٹ اٹینڈنٹ کام کر رہی ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ قبل تک یہ ملازمت صرف دوسرے ملکوں کی خواتین کے لیے مختص تھی۔

اشواق نصر کو اس شعبے میں کام شروع کرنے والی پہلی خاتون ہونے پر فخر ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ ’میں اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے والدین کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنھوں نے فلائٹ اٹینڈنٹ بننے کے لیے میری حوصلہ افزائی کی۔ میں سعودی ایئرلائن کی بھی ممنون ہوں جس نے مجھے یہ موقع فراہم کیا۔‘

اشواق نصر کی ایک ساتھی ریحام باہمیشان نے کہا کہ ’میں بچپن سے ہی اس بات پر حیران ہوتی تھی کہ سعودی خواتین فلائٹ اٹینڈنٹ کیوں نہیں ہیں۔‘

انہوں نے بتایا کہ ’جب بعد میں مجھے پتہ چلا کہ سعودی ایئرلائن اس جاب کے لیے درخواستیں وصول کر رہی ہے تو میں بہت خوش ہوئی اور میں نے بھی درخواست دے دی۔‘

❁❁❁

حوریم سلطان سے قسم سلطان تک

سلطنتِ عثمانیہ کی شاہی کنیزیں جو کسی ملکہ جتنی بااثر تھیں

قسط اوّل

یہ سنہ ہے 1603 اور منظر ہے سلطنتِ عثمانیہ کے سلطان احمد اول کے اقتدار کے پہلے سال میں ترک شاہی حرم کا! یونان کے گاؤں سے سلطان کے لیے تحفے کے طور پر اغوا کر کے لائی گئی ایک دبلی پتلی سی لڑکی نئے سلطان کی دادی صفیہ سلطان کے قدموں میں گر کر گھر واپس جانے کی بھیک مانگ رہی ہے۔

صفیہ سلطان اسے بتاتی ہیں کہ اب یہ ناممکن ہے اور پھر پیار سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک مشورہ دیتی ہیں۔ 'دیکھو بیٹی، ایک عورت کو اپنی زندگی میں کئی کردار نبھانے پڑتے ہیں۔ وہ زندگی کے ہر مرحلے میں ایک مختلف انسان ہوتی ہے۔ ایک بچی، ایک عورت، ایک ماں، اور، اگر وہ سمجھدار ہے اور اس پر خدا کی مہربانی ہے تو وہ سلطانہ بھی بن سکتی ہے۔ فرق صرف اس بات سے پڑتا ہے کہ وہ خود اپنے لیے کیا انتخاب کرتی ہے۔'

پھر صفیہ سلطان اپنی بات ختم کرتے ہوئے انستاسیا نامی اس لڑکی سے کہتی ہیں کہ 'اطمینان رکھو، تمہارا مستقبل بہت روشن ہے۔' یہ تو تھا انستاسیا کی زندگی پر بنی ترک ٹی وی سیریز قسم سلطان کا ایک منظر۔ اب سلطنت عثمانیہ کے مختلف حصوں سے اغوا ہو کر اور غلام بن کر شاہی حرم میں پہنچنے والی کچھ لڑکیوں کی حقیقی زندگی پر ایک نظر ڈالتے ہیں، جن کا بعد میں شمار اپنے دور کی طاقتور ترین عالمی شخصیات میں ہوا۔

سن 1520 کے ستمبر میں جب سلطان سلیمان کو سلطنت عثمانیہ کے 10 ویں حکمران کی حیثیت سے تخت ملا تو اس کی حدود میں مشرقی بحیرۂ روم، بحیرۂ اسود اور اس کے ساحلی علاقے، آج کے مشرق وسطیٰ میں شامل زیادہ تر علاقے اور جنوب مشرقی یورپ شامل تھا۔ ان کے دور کے ابتدائی برسوں میں ہی بلغراد اور بحیرۂ روم میں رہوڈز کے اہم جزیرے کی فتوحات سے شروع ہو کر سلطنت کی حدود مغرب میں یورپ اور مشرق میں ایشیا میں مزید پھیل گئیں۔

اس وسیع و عریض سلطنت پر تقریباً 50 سال حکمرانی کرنے والے سلطان سلیمان کو یورپ میں اپنی جاہ و حشم کی وجہ سے سلیمان محتشم اور ترکی میں، قانون میں اہم تبدیلیوں کی وجہ سے، سلیمان قانونی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن سلطان سلیمان کے دور میں بظاہر ایک دور رس اثرات والی پیشرفت ان کے حرم اور زندگی میں ایک کنیز کی آمد تھی جسے حرم میں خرم سلطان کا نام دیا گیا اور جسے آج حوریم سلطان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سلطان سلیمان کے حرم میں اس سے پہلے بھی کنیزیں تھیں اور ان کے پہلے سے بچے بھی تھے لیکن ان کے اور حوریم سلطان کے تعلق کی اس سے پہلے مثال نہیں تھی اور ایک مؤرخ کے نزدیک سلطنت عثمانیہ کے اس دور کو 'سلیمان اور روکسیلانا کا دور' بھی کہا جا سکتا ہے۔

حوریم سلطان کی سلطان سلیمان کی زندگی میں آمد کے بعد، اُس سلطنت کی تاریخ میں، جس میں ملکہ کا کوئی باقاعدہ عہدہ نہیں تھا، اس دور کا آغاز ہوتا ہے جسے مؤرخ 'عورتوں کی سلطنت' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مؤرخ لیسلی پیئرس سلطنت عثمانیہ میں شاہی حرم اور عورتوں کے کردار کے بارے میں اپنی کتاب 'امپیریل حرم: ویمن اینڈ سوورینٹی ان دی اوٹومن ایمپائر' میں لکھتی ہیں کہ 'عثمان (پہلا سلطان) اور ان کے بیٹے اور ان کی نسلوں کے بعد بظاہر سلاطین کے سب بچے کنیز ماؤں سے پیدا ہوئے تھے۔'

لیکن 'سنہ 1520 میں حوریم سلطان کے دور کے آغاز سے لے کر 17ویں صدی کے وسط میں قسم سلطان کی موت تک سلطنت عثمانیہ کئی اعتبار سے ان خواتین کے زیر اثر تھی جن کی طاقت کی بنیاد اس بات پر تھی کہ وہ اپنے دور میں سلطان کی پسندیدہ کنیزیں تھیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حرم سیاست کا مرکز بن گیا تھا۔ 'حرم کا مرکزی رجحان سیکس نہیں بلکہ خاندانی سیاست تھا۔' کنیزوں کے اثر و رسوخ کے اس دور کے چار اہم کردار ہیں: خرم یا حوریم سلطان، ان کی بہو نوربانو سلطان اور پھر ان کی بہو صفیہ سلطان اور آخر میں صفیہ سلطان کے پوتے سلطان احمد اول کی پسندیدہ کنیز قسم سلطان۔

عثمانوی تاریخ میں 'عورتوں کی سلطنت' کا یہ زمانہ یورپ میں بھی طاقتور ملکاؤں کا زمانہ تھا جن میں انگلینڈ کی الزبتھ اول اور فرانس کی کیتھرین دا میدیچی شامل ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یورپ کے مختلف علاقوں سے اغوا ہو کر اور 'بازار میں بِک کر' عثمانوی حرم میں پہنچنے والی ان کنیزوں کی دنیا کے دوسرے شاہی خاندانوں سے برابری کی سطح پر اور پورے شاہی ادب آداب کے ساتھ خط و کتابت بھی ہوئی۔ 'انگلینڈ کی ملکہ الزبتھ اول نے صفیہ سلطان کو سن 1593 میں تحفے میں اپنا پورٹریٹ بھی بھیجا تھا۔'

مؤرخ لیسلی پیئرس کی حوریم سلطان کی زندگی پر سن 2020 میں شائع ہونے والی کتاب 'ایمپرس آف دی ایسٹ' (مشرق کی ملکہ) کا موضوع بھی یہی ہے کہ ایک غلام لڑکی کیسے سلطنت عثمانیہ کی ملکہ بن جاتی ہے؟ انھوں نے لکھا کہ 'عثمانیوں میں ملکہ کا باقاعدہ عہدہ نہ ہونے کے باوجود روکسیلانا (حوریم سلطان) نے یہ کردار ادا کیا اور انھوں نے 16ویں صدی میں یورپ کی نامور ملکاؤں کی بھرپور انداز میں برابری کی۔'

حوریم سلطان کہاں سے آئی تھیں

پیئرس نے 'ایمپرس آف دی ایسٹ' میں لکھا ہے کہ ہمیں روکسیلانا کے اصل نام، جائے پیدائش، تاریخ پیدائش اور والدین کے بارے میں معلومات نہیں ہیں۔ تاہم وہ لکھتی ہیں کہ ان کی اس زمانے میں بہت زیادہ اہمیت کے پیش نظر کچھ باتوں پر یقین کیا جا سکتا ہے جیسا کہ ان کا تعلق یوکرین کے علاقے رُتھینیا سے تھا جو اس وقت پولینڈ کا حصہ تھا۔ روکسیلانا کا مطلب بھی 'رُتھینیا کی لڑکی' ہے اور یورپ والے انھیں اس نام سے پکارا کرتے

تھے۔ پیرس کے مطابق ایک بات مکمل یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کی پیدائش مسیحی خاندان میں ہوئی تھی۔ کچھ عثمانی روایات کے مطابق روکسیلانا ایک پادری کی بیٹی تھی۔ ترکی میں عثمانوی تاریخ اور قانون کے ایک پروفیسر اکرم بوراا کنجے نے حوریم سلطان کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ اس کا اصل نام الیگزانڈرا لیسووسکا تھا اور اسے 12 سال کی عمر میں کریمیا کے تاتاریوں نے اغوا کر کے استنبول بھیج دیا تھا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ شاہی حرم میں باقی کنیزوں کی طرح حوریم سلطان کی بھی کئی سال تک شاہی آداب، عثمانی علوم اور اسلام کے بارے میں تربیت ہوئی اور پھر انھیں ان کی خوش مزاج طبیعت اور مسکراتے چہرے کی وجہ سے خرم نام دیا گیا (جو جدید ترک میں حوریم بن گیا)۔

پیرس نے ایک سے زیادہ بار حوریم کی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی مشکلات کا ذکر کیا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی تفصیل سے بتایا ہے کہ اس زمانے میں شاہی حرم کی زندگی کے بارے لکھی گئی بہت سی کتابیں سنی سنائی باتوں پر مشتمل تھیں اور زیادہ قابل اعتبار نہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ روکسیلانا سنہ 1520 میں ستمبر میں سلطان سلیمان کی تخت پوشی کے کچھ ہی مہینوں کے بعد ان کے حرم کا حصہ بن گئی تھیں، اس وقت سلطان کی عمر 26 برس اور روکسیلانا تقریباً 17 برس کی تھیں۔ سن 1521 میں ان کا پہلا بیٹا پیدا ہوا۔ ان کے سلطان سے ایک بیٹی اور چار (کچھ ذرائع کے مطابق پانچ) بیٹے ہوئے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بظاہر اس معمول کی بات نے اس وقت سلطنت عثمانیہ کو تشویش میں ڈال دیا تھا۔ پہلے بیٹے کی پیدائش تک تو بات ٹھیک تھی لیکن اس کے بعد اسی کنیز کے ساتھ تعلق جاری رکھنا مؤرخین کے مطابق سلطنت کی نسلوں پرانی روایات کے خلاف تھی۔ سلطنت عثمانیہ اس وقت تک دو صدیاں اور نو سلطان دیکھ چکی تھی اور مؤرخین کے مطابق 'ایک عثمانی سلطان کے لیے، کسی بھی اور بادشاہ کی طرح، سیکس صرف مزے کی چیز نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اس کے اہم سیاسی نتائج تھے۔۔۔ خاندان کے اقتدار کی بقا کا دارومدار اسی پر تھا۔ یہ ایسا فعل نہیں تھا جو نتائج کو دھیان میں رکھے بغیر کر لیا جائے۔۔۔۔۔ حرم میں سیکس کے کچھ ضوابط تھے۔'

اس وقت ان ضوابط کے تحت ایک کنیز سلطان کے بیٹے کی ماں بننے کے بعد اس سے جسمانی تعلق نہیں جاری رکھ سکتی تھی۔ مؤرخین بتاتے ہیں کہ ایک کنیز ایک بیٹا کی پالیسی کی بنیاد یہ تھی کہ ماں ایک شہزادے کو پوری توجہ دے سکے اور کبھی اسے دو یا اس سے زیادہ بیٹوں میں ایک کا انتخاب کرنے کی نوبت نہ آئے۔

پیرس لکھتی ہیں کہ سلطان اور حرم کی خواتین کے درمیان سیکس وارث پیدا کرنے کی پیچیدہ سیاست سے کنٹرول ہوتی تھی۔

اگر کسی کا خیال تھا کہ خرم کا سلطان کے ایک سے زیادہ بیٹوں کی ماں بننا غلط تھا تو سنہ 1536 میں سلطان سلیمان نے اپنی پسندیدہ کنیز حوریم سلطان سے شادی کر کے نہ صرف اپنی عوام بلکہ استنبول میں تعینات اہم عالمی سفارتکاروں کو ایک بار پھر حیران کر دیا۔

اس کے بعد جب حوریم کے بیٹے روایت کے مطابق صوبوں میں فرائض انجام دینے گئے تو ان کے ساتھ جانے کی بجائے وہ سلطان کے ساتھ استنبول میں رہیں۔ یہ ایک اور روایت کی خلاف ورزی تھی۔ مؤرخ بتاتے ہیں کہ عثمانوی عوام کی نظر میں کسی سلطان کا ایک شخص کے اثر میں ہونا ناقابل قبول تھا کیونکہ ان کے نزدیک سلطان کو اپنا فرض ادا کرنے کے لیے ہر بندھن سے آزاد ہونا چاہیے تھا۔

حوریم سلطان اب مکمل طور پر حرم کی سیاست میں گھر چکی تھی۔ خرم سلطان سے پہلے سلطان سلیمان کا ایک اور کنیز ماہیدیورن سے بھی ایک بیٹا تھا جس کا نام مصطفیٰ تھا۔ یہ بیٹا سلطان کی تخت نشینی سے پہلے پیدا ہوا تھا اور عوام اور عسکری حلقوں میں بہت مقبول تھا اور سب کا خیال تھا کہ اگلا سلطان یہی بنے گا۔ سلطنت عثمانیہ میں اس وقت تو جو روایت چلی آ رہی تھی اس کے مطابق ہر سلطان کی موت کے بعد شہزادوں میں تخت کے لیے کشمکش ہوتی تھی جو ایک کے علاوہ سب کی موت تک جاری رہتی۔

پیرس لکھتی ہیں کہ حوریم سلطان اپنا پیدائشی خاندان تو کھو چکی تھی اب شاید دوسرا خاندان کھونے کا خدشہ اس کے ذہن میں رہتا ہو گا کہ اگر مصطفیٰ سلطان بن گیا تو اس کے بچوں کا کیا ہو گا۔ مؤرخین کے مطابق اس وقت سلطنت کے وزیر اعظم ابراہیم پاشا کی ہمدردیاں بھی مصطفیٰ کے ساتھ تھیں۔ اب حالات کچھ اس طرح آگے بڑھے کہ مصطفیٰ اور ابراہیم دونوں کو سلطان نے عہدوں کی حدود پار کرنے اور بغاوت کی منصوبہ بندی کے الزام میں مروا دیا۔ اس کے بعد اب یہ طے ہو گیا کہ سلطان سلیمان کے بعد حوریم سلطان کا ہی کوئی بیٹا تخت پر بیٹھے گا۔ حوریم سلطان کا اپنے خاوند سے آٹھ سال پہلے سن 1558 میں انتقال ہو گیا اور وہ شہزادے سلیم کو تخت پر بیٹھتے ہوئے نہیں دیکھ سکیں۔ یاد رہے کہ حوریم سلطان اور سلطان سلیمان کے بیٹے بایزید کو بھی بغاوت کے الزام میں مروا دیا گیا تھا۔

حوریم سلطان تاریخ کا ایک متنازع کردار ہے جس کے بارے میں کئی صدیاں گزرنے کے بعد بھی بحث جاری ہے۔ پیرس لکھتی ہیں کہ سلطان سلیمان اور ان کا تعلق اتنا غیر روایتی تھا کہ دوبارہ عثمانی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

حوریم سلطان اپنی زندگی میں ہی متنازع ہو گئی تھیں اور 'کئی صدیاں گزرنے کے بعد بھی ان کے عثمانی تاریخ میں مقام کے بارے میں بحث ختم نہیں ہوئی۔' ان پر اسی دور میں سلطان پر جادو کرنے کی باتیں کی جاتی تھیں۔ پیرس کہتی ہیں کہ عوامی سطح پر سب الزام حوریم پر ڈالنا اس لیے آسان تھا کیونکہ سلطان سے تو غلطی کا تصور نہیں تھا۔

حوریم سلطان کی کامیابی

پیرس لکھتی ہیں کہ حوریم سلطان کی بڑی کامیابیوں میں سلطنت بھر میں پھیلے ہوئے فلاحی کام تھے۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ انھوں نے مسجدیں، ہسپتال، یتیم خانے، لنگر قائم کرنے اور پینے کے پانی کی سہولیات میں بہت دلچسپی لی اور خیراتی ادارے بھی قائم کیے۔ وہ لکھتی ہیں کہ حوریم سلطان غلاموں کو آزاد کروانے میں بہت دلچسپی لیتی تھیں جس کی وجہ شاید ان کا اپنا ماضی کا تجربہ تھا جسے وہ نہیں بھلا سکی تھیں۔ انھوں نے لکھا کہ ان کے فلاحی کاموں ان کے بعد بھی نچلی سطح تک ہزاروں خواتین کو فائدہ پہنچا۔ ان کے قائم کیے گئے کئی فلاحی ادارے آج بھی قائم ہیں۔ حوریم سلطان سفارتی محاذ پر بھی بہت متحرک تھیں۔ اس کی ایک مثال کے طور پر سلطان سلیمان کے دور میں خرم سلطان کے آبائی علاقے پولینڈ سے سلطنت کا مسلسل

رابطہ رہا۔ پولینڈ کے بادشاہ سجیسمنڈ اوّلا حوریم سلطان کی کوششوں کی وجہ سے سلطنت عثمانیہ کے ساتھ امن قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔ یہی نہیں بلکہ حوریم سلطان کا خط کے ذریعے صفوی بادشاہ شاہ تہماسپ کی بہن سلطانم سے بھی رابطہ تھا۔ پیئرس لکھتی ہیں ممکن ہے کہ جب سلطان سلیمان کا مقصد صلح ہوتا تھا وہ حوریم سلطان کے ذریعے بات کرتے تھے۔

پیئرس نے عثمانی سلطنت میں حرم کی زندگی کے بارے میں اپنی کتاب 'امپیریئل حرم' میں لکھا ہے کہ '16ویں اور 17ویں صدیوں میں عثمانوی سلطنت کے سفارتی محاذ پر خاص طور پر چار خواتین نمایاں تھیں: حوریم، نور بانو، صفیہ اور قُسم۔' اور ان کے ذریعے قائم کیے گئے سفارتی روابط نے سلطنت کی بہت مدد کی۔

حوریم سلطان کے بعد آنے والی شاہی خواتین کے ذکر کی طرف بڑھنے سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ یہ نوعمر لڑکیاں دور دراز علاقوں میں انسانوں کی منڈیوں سے کن تجربات سے گزر کر استنبول پہنچی تھیں۔ 'اغوا کے تجربے سے گزرنا کسی کمزور انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔' حوریم سلطان کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ جب انھوں نے اپنی رہائش گاہ پرانے محل سے نئے شاہی محل میں منتقل کی تو حرم کو سیاست کے مرکز کے قریب لے آئیں۔ ایسا کرنے سے حرم ایک سیاسی طاقت بن گیا اور آئندہ آنے والے وقتوں میں حرم کی سینئیر خواتین کے لیے سیاسی حلقوں میں رابطے قائم کرنا ممکن ہو گیا۔

حوریم سلطان یوکرین سے استنبول میں شاہی حرم تک کیسے پہنچیں؟

پیئرس اپنی کتاب 'ایمپرس آف دی ایسٹ' میں لکھتی ہیں کہ 15 صدی کے اختتام کے بعد سے حوریم سلطان کا آبائی علاقہ سمجھا جانے والا رتھینیا ان علاقوں میں شامل تھا جو انسانوں کی تجارت سے بری طرح متاثر تھے اور اس کے پیچھے زیادہ تر کریمیا کے تاتاریوں کا ہاتھ تھا۔ تاہم وہ اس کاروبار سے منافع کمانے والے پہلے لوگ نہیں تھے کیونکہ بحیرہ اسود کا یہ علاقہ زمانہ قدیم سے غلاموں کی تجارت کا مرکز رہا ہے اور 'سلطنت روم اور پھر بازنطینی سلطنت اور بغداد کی مشہور عباسی خلافت میں بھی اس تجارت کے خریدار رہے ہیں۔'

انھوں نے لکھا کہ اس زمانے میں انسانوں کی تجارت اور کسی کو جنگ میں قیدی بنانے میں بہت باریک فرق رہ گیا تھا۔ تاتاری اپنے آپ کو مڈل مین نہیں بلکہ جنگجو سمجھتے تھے اور کافا شہر میں غلاموں کی منڈی میں کاروبار کرنے والوں میں 'یہودی، یونانی، آرمینیائی اور کچھ اطالوی شامل تھے۔۔۔ دوسرے لفظوں میں غیر مسلم۔'

پیئرس لکھتی ہیں کہ یورپ میں ان تاتاریوں کے خلاف شدید جذبات پائے جاتے تھے لیکن تنقید کرنے والوں کو 'لوگوں کے غلام بننے سے کم اور اس بات سے زیادہ مسئلہ قیدیوں کے مسلمان بنائے جانے کے امکان سے تھا۔' 'غلامی ان (تنقید کرنے والے یورپیوں) کے لیے نئی بات نہیں تھی، انھوں نے خود کبھی بحیرۂ اسود کی انسانوں کی منڈیوں سے۔۔۔ خریداری کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی تھی۔'

انھوں نے لکھا کہ کریمیا کے تاتاری لوگوں کو تجارت کے لیے قیدی بنانے کے بعد سلطنت عثمانیہ کی حدود میں کافا نامی شہر (موجودہ نام فیوڈوشیا) لاتے تھے جہاں سے سمندری سفر کے ذریعے انھیں استنبول لایا جاتا تھا۔ وہ لکھتی ہیں کہ روکسیلانا کو بھی روتھینیا سے اسی راستے سے استنبول لایا گیا ہو گا۔ کریمیا کا یہ پڑوسی علاقہ براہ راست سلطنت عثمانیہ کے زیر انتظام تھا۔ اور اگر ذرائع قسم سلطان کے بیٹے سلطان ابراہیم کی پسندیدہ کنیز اور سلطان محمد چہارم کی والدہ ظورخان سلطان کے رتھینیا سے تعلق کے بارے میں درست ہیں تو یہ مشکل سفر انھوں نے بھی کیا ہو گا۔ پیئرس کے مطابق اس علاقے میں تاتاریوں کا پہلا بڑا حملہ سنہ 1468 میں ہوا ہو گا جب تقریباً 18000 مرد، عورتیں اور بچے قیدی بنائے گئے۔ اس کے بعد تقریباً ہر سال اس طرح کے حملے ہوتے رہے۔

پیئرس کے خیال میں روکسیلانا سنہ 1516 میں ہونے والے ایک حملے میں قیدی بنی ہوں گی۔ اس برس مختلف اندازوں کے مطابق پانچ سے 40 ہزار لوگ غلام بنائے گئے تھے۔ انھوں نے پولینڈ کے ایک مؤرخ کا حوالہ دیا جن کے مطابق روکسیلانا کے علاقے میں 1509 میں ایک حملہ ہوا تھا وہ شاید اس میں قیدی بنی ہوں۔ سنہ 1578 میں کریمیا کے دربار میں پولینڈ کے سفیر نے ان حملوں کی تفصیل بتائی کہ یہ موسم سرما میں ہوتے ہیں جب دریا اور جھیلیں جم چکی ہوتی ہیں اور حرکت تیزی سے ہو سکتی ہے اور 'قیدیوں کو مناسب خوراک بھی نہیں ملتی جنھیں بیڑیوں میں پیدل چلایا جاتا ہے۔'

رتھینیا سے استنبول تک کا سفر روکسیلانا جیسی کم عمر لڑکی کے لیے معمولی بات نہیں تھی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سن 1509 میں ہی سلطان سلیمان کی شہزادے کی حیثیت سے پہلی تعیناتی 15 سال کی عمر میں کافا میں ہی تھی جہاں وہ گورنر بنا کر بھیجے گئے تھے۔

نور بانو اور صفیہ سلطان

لیسلی پیئرس اپنی کتاب 'امپیریئل حرم' میں بتاتی ہیں کہ حوریم سلطان کے بیٹے سلیم دوم کی پسندیدہ کنیز اور پہلی طاقتور والدہ سلطان نور بانو کا پیدائشی نام سیسیلیا تھا۔ وہ وینس کے دو اعلیٰ خاندانوں کے ارکان کی بغیر شادی کے اولاد تھیں۔ عثمانی ایڈمرل باربروسا کے قبضے میں آنے کے بعد وہ 12 سال کی عمر میں غلام کی حیثیت سے شاہی حرم کا حصہ بنی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان سلیم دوم نے بھی اپنے والد سلطان سلیمان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے نور بانو سے شادی کر لی تھی۔

سنہ 1574 میں جب سلطان سلیم کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے مراد سوم تخت پر بیٹھے اور صفیہ سلطان ان کی پسندیدہ کنیز تھیں جو مؤرخین کے مطابق البانیہ سے قیدی بن کر شاہی حرم تک پہنچی تھیں۔ نور بانو اور صفیہ سلطان اس دور کا حصہ ہیں جب والدہ سلطان کا عہدہ بہت اہمیت اختیار کر چکا تھا۔ عثمانی تاریخ میں ماں اور بیٹے کا تعلق ہمیشہ سیاسی طور پر اہم تھا لیکن اسے باقاعدہ طور پر تسلیم 16ویں صدی کے اختتام پر کیا گیا۔ 'اگرچہ یہ شاہی مائیں براہ راست اقتدار کا حق نہیں رکھتی تھیں لیکن یہ اس اقتدار کے سرچشمے کی نگران ضرور تھیں۔'

❀❀❀

اکثر لوگ مکڑیوں کو ہلاک کرنے والوں کو برا کیوں نہیں سمجھتے

امریکی ریاست نیو ہیمپشائر میں اب سرکاری اعلان کے مطابق باقاعدہ طور پر حیوانِ عنکبوت (یعنی عنکبہ، مکڑی، جوں اور بچھُّو وغیرہ جیسے حشرات الارض) کے موسم کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہاں گھروں میں لاکھوں کی تعداد میں مکڑیاں نمودار ہو رہی ہیں اور ان کے لیے بہتر ہے کہ وہ اپنی حفاظت کریں۔ لیکن ہم انھیں یوں ہی بڑے آرام کے ساتھ کیوں مار دیتے ہیں؟

میں نے جیسے ہی اپنے گھر میں داخل ہونے والا دروازہ کھولا میں نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر آنے والی ایک رکاوٹ کے لیے تیار کر لیا۔

سب سے پہلے مجھے گھر کے گارڈن والے شیڈ میں بنے سٹور سے کسی شہ کو لانا تھا۔ چوہوں کے چھوٹے بچوں کے سائیز کے برابر بد ہیبت مکڑیوں کی آماجگاہ جہاں یہ اپنی لمبی ترنگی ٹانگوں پر لگے ہوئے نرم نرم بالوں کے ساتھ گھوم پھر رہی ہوتی ہیں۔ پھر مجھے بچھو جیسی شکل کے گھن کے کیڑوں سے احتیاط کے ساتھ بچتے بچاتے زمین پر لگی ہوئی چند سلیبز کو ہٹانا پڑتا ہے، جنھوں نے ان کے نیچے اپنے گھر بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھر میں نے اپنے گھر میں گل یاسمین کی باڑ لگائی تھی تاکہ وہ کہیں ان حشرات کی زد میں نہ آ جائیں جو ان پودوں کے اوپر چڑھ سکتے ہیں۔

بالآخر میں اپنے گھر کے صحن میں پہنچ گیا۔ اور جب میں یہاں پہنچا تو میں سکتے میں آ گیا۔ وہاں کے فرش پر میں نے کسی دھاری دار سڑے ہوئے کیڑے کو اپنی لمبی لمبی ٹانگیں پھیلائے ہوئے مردہ حالت میں دیکھا۔ اس طرح کی تصویر پیش کرنے والے حشرات میرے گھر کے باغ میں گذشتہ تین برس سے اکثر و بیشتر اس قسم کے نقوش چھوڑ جاتے تھے، اور اس دوران ایک کچھ عجیب و غریب بات ہوئی: میں نے ان کیڑوں کو پسند کرنا شروع کر دیا۔

اپنے گھر کے کوڑے دان میں اس مخلوق کا ایسا زوال کسی رونگٹے کھڑے کر دینے والی خونی مخلوق کا انجام نہیں لگتا تھا، بلکہ کسی پالتو جانور کا منظر لگتا تھا جس کا دل دھڑکنا بند ہو گیا ہو۔

تاہم ہر مکڑی کا انجام اس طرح کے پرسکون انداز میں نہیں ہوتا ہے۔ ہم جیسے ہی انھیں اپنے فرش پر رینگتے ہوئے دیکھتے ہیں، یا انھیں اپنے گھر کی چھت کے کسی کونے میں اپنا جال بنتے ہوئے لٹکتا ہوا دیکھتے ہیں، تو ان کو عموماً کچل دیتے ہیں، یا ان پر کیڑے مار ادویات چھڑک دی جاتی ہیں، یا انھیں صفائی والے ویکیوم مشین سے تلف کر دیا جاتا ہے یا انھیں گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔ بہت سارے لوگ اپنی طاقت کا استعمال کرتے ہوئے اتنے آرام سے یونہی انھیں ہلاک کیسے کر دیتے ہیں، جیسے کہ یہی ان کی فطرت ہو؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب بھی ممکن ہوا انسان ایک معمول کے تواتر کے ساتھ جانوروں کو تلف کرتا رہتا ہے۔ اس تلخ حقیقت کے بغیر فارمنگ یا لیبارٹری میں تجربات کرنا شاید ممکن ہی نہ ہوں۔ لیکن مکڑیوں جیسی مخلوقات کے ہلاک کیے جانے کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے جیسے کہ کوئی ایک بڑی فتح حاصل کی گئی ہو۔

مکڑیوں کو تلف کرنے والی ایک دوا کے بارے میں ایمزان پر لکھے گئے ایک تبصرے میں درج تھا کہ 'میرے باتھ روم میں مکڑیوں کا ایک جال تھا جس پر میں نے یہ دوا چھڑکی، وہ ایک منٹ کے اندر ہلاک ہو گیا۔ یہ بہت ہی موثر دوا ہے۔' ایک اور صارف نے اس دوا کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا 'مکڑیوں کی لاشیں (بہت زیادہ تعداد میں) اپنے جال میں زمین پر لٹک رہی تھیں۔'

زندگی کی ایک پیچیدہ شکل

ان مکڑیوں کا اس قسم کا قتلِ عام آپ کے لیے بہت ہی پریشان کن ہو گا اگر آپ کے علم میں یہ بات آئے کہ مکڑیوں اور انسانوں کی زندگی میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ اگرچہ 53 کروڑ برس پہلے ارتقا کے سفر کے دوران ہمارے رستے جدا ہو گئے تھے، تاہم ہمارے اعضا اور جسم کے کئی حصے، مثال کے طور پر گھٹنے کی چپنی اور ڈوپامائین سے لے کر ایڈرالین تک دماغ میں پیدا ہونے والی کیمیائی رطوبتیں، ایک جیسی ہیں۔ کسی نے مکڑی کے جذبات کے بارے میں کوئی تحقیق کرنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے۔ لیکن ان کے جذبات کو سمجھنا ہمارے اندازوں سے زیادہ آسان ہے۔

اسی طرح ان کے سر ان کے کاندھوں پر زیادہ بھاری نہیں ہوتے ہیں (یا ان کی ٹانگوں پر زیادہ بھاری نہ ہوں --- بعض اوقات ایک مکڑی کے سر میں اتنی جگہ ہی نہیں ہوتی ہے کہ اس کا بھیجا اُس میں سما سکے)۔ لیکن کچھ ایسی بھی مکڑیاں ہوتی ہیں جو بہت ہی زبردست پیچیدہ ذہانت کی مالک ہوتی ہیں، مثال کے طور پر وہ اپنے شکار کو پھانسنے کے لیے مختلف پیچیدہ قسم کے رستے بدلنے کی منصوبہ بندی کر سکتی ہیں۔ ان میں ان کی ضرورت کی ایک منفرد قسم کی ذہانت ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ اپنا جال بننے کی منصوبہ بندی پر غور و فکر کرتی ہیں۔

اور اگر وہ ہیجان کا شکار انسان کے حملے سے بچ جائیں تو مکڑیوں کی ایسی کئی انواع ہیں جو کئی دہائیوں تک زندہ رہ سکتی ہیں۔

کرہ ارض پر سب سے قدیم معروف مکڑی- نمبر 16 کے نام سے شناخت کی جانے والی ایک ٹراپ ڈور مکڑی --- نے 43 برس کی ایک قابل فخر طویل زندگی بسر کی۔ اس پورے وقت میں اس کا صرف ایک گھر تھا، جنوب مغربی آسٹریلیا میں تمین کے قریب بنگو لو ریزرو کے ایک بل میں۔ سنہ 2018 میں اس مکڑی کی موت کے وقت،

لیانڈا میسن- ایک ماہر ماحولیات جنہوں نے اس کے مطالعے میں کئی سال گزارے تھے- نے واشنگٹن پوسٹ کو بتایا کہ کس طرح وہ اذیت ناک طور پر 'اپنے عروج کے دور میں اپنے انجام کو پہنچی '، ایک پرجیوی کیڑے کے ڈنگ سے وہ ہلاک ہوئی تھی۔

اگر ہمیں مکڑی کی زندگی کو اہم سمجھنے کے لیے کسی اور وجہ کی ضرورت ہوتی ہے تو یہ حقیقت ہے کہ - جیسا کہ آج تمام زندہ جانوروں کی طرح- ہر مکڑی اپنے کامیاب اجداد کی ایک اٹوٹ نسل کی پیداوار ہے جس کا زمین پر پہلی زندگی کے ساتھ آغاز ہوا تھا یعنی تین ارب اسی کروڑ برس قبل۔حیرت انگیز مشکلات کے خلاف،اس خاص مکڑی کے آباؤاجداد اور ان کے بھی آباؤاجداد- اور اسی طرح اوپر کی کئی نسلیں،ہزاروں برسوں تک- اپنی نسلیں دوبارہ پیدا کرنے کے لئے کافی دیر تک زندہ رہنے میں کامیاب رہیں۔پھر ایک بھاری پاؤں والا انسان باتھ روم میں مکڑی پر قدم رکھتا ہے کیونکہ یہ اُس کے لیے ایک معمولی پریشانی بھی نہیں ہے۔

جیفری لاک ووڈ کے مطابق، کئی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے ہم مکڑیوں کے ساتھ ہمدردی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں- درحقیقت یہ بدقسمت مخلوق الگ الگ خصوصیات کا ایک مرکب بنتی ہے جسے اتفاقات نے ایک ایسے پیچ کی شکل دے دی ہے جو ہمیں منفرد طور پر ناگوار دکھائی دیتا ہے۔

وؤمنگ یونیورسٹی میں نیچرل سائینسز اور ہیومنیٹیز کے پروفیسر لاک ووڈ کہتے ہیں 'میں لوگوں سے کہتا ہوں کہ ارتقاء اور ثقافت کی کامل شکل مکڑی ہے- ٹھیک ہے یہ ایک ہے اور اگر آپ کوئی کیڑا چننے جارہے ہوں تو آپ کے ذہن میں کھٹل آئیں گے۔' پروفیسر لاک ووڈ 'ایک تحقیق' متاثرہ دماغ: کیوں انسان خوفزدہ، نفرت اور کیڑوں سے محبت کرتے ہیں' کے مصنف بھی ہیں۔

ایک قدیم دشمن

شاید سب سے واضح وجہ جو ہم مکڑیوں کو کچلنے کے جواز کے طور پر پیش کرتے ہیں وہ آٹھ ٹانگوں والی چیزوں سے ہمارا ایک نفسیاتی خوف ہے جو اس مخلوق کے لیے ہماری ہمدردی کو مشکل بنا دیتا ہے۔

انسانی شیرخوار بچے صرف پانچ مہینے کی عمر میں ہی دیگر کیڑوں کی نسبت مکڑیوں کی تصویروں سے زیادہ خطرہ محسوس کرتے ہیں۔اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم میں ان سے ہماری نفرت جزوی طور پر پیدائشی ہے،شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہمیں ہمارے ارتقا کے دوران زہریلے جانوروں کو غلطی یا اتفاقیہ طور پر انتخاب کرنے سے روکا جائے۔

اس قدرتی محتاط والے رویے کو پھر ثقافتی وجوہات عام لوگوں کے لیے مزید پیچیدہ بنا دیتی ہیں،جیسے والدین جو انہیں بڑے ہوتے ہوئے خوفناک قرار دیتے ہیں۔زیادہ انتباہ دینے والے اخباری مقالے اور دیگر طرز کے ابلاغی مواد سے اس کے بارے میں پریشانی کے بڑھنے کا امکان ہوتا ہے۔

تاہم اس سارے معاملے کی وجہ صرف خوف نہیں ہے- خاص طور پر اس وجہ سے کہ ہمیں دوسرے آرتھروپیڈس (مکڑی کی طرح کے ریڑھ کی ہڈی کے بغیر حشرات اور جانور) سے وہی نفرت نہیں ہوتی ہے جو مکڑی سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔

اس کی ایک ممکنہ وضاحت یہ ہے کہ مکڑیاں دیکھنے میں اس زمین کی مخلوقات سے کتنی زیادہ غیر ارضی یا مختلف نظر آتی ہیں یعنی کسی اور سیارے کی مخلوق نظر آتی ہیں، آنکھوں کی غیر معقول تعداد کے ساتھ - 12 آنکھوں تک- بہت زیادہ ٹانگیں اور بغیر دانتوں کے فنگز۔ان کا رویہ بھی بیشتر دودھ دینے والے جانوروں سے بالکل مختلف ہے- بے خبر حشرات کو پھنسانے کے لیے جال بنانا، پھر ان کے اندر کا حصہ چوسنا، یا ان کے ساتھیوں کو کھانا اور اتفاقی طور پر اپنی نوع کی ایک بہت بڑی نسل پیدا کرنا۔

لاک ووڈ کا کہنا ہے کہ 'اور اس طرح ان کی ناواقفیت ایک طرح کی کئی عمومی خصوصیات سے جڑی ہوئی ہے تاکہ وہ دوسروں سے مختلف نظر آئیں- میرے خیال میں تکنیکی اصطلاح یہ ہے کہ ہم انہیں ڈراؤنا سمجھتے ہیں۔'

مکڑیاں بھی جینیاتی طور پر اجنبی ہیں۔اگرچہ انسانوں اور مکڑیوں کا ایک دوسرے کے ساتھ دور کا تعلق بنتا ہے، تاہم ہماری ان سے کوئی قریبی رشتہ داری نہیں ہے، جیسا کہ ہم دودھ دینے والے دوسرے جانوروں یا یہاں تک کہ رینگنے والے جانوروں کے قریبی رشتہ دار سمجھے جاتے ہیں۔

یہ ممکنہ طور پر پریشانی کا ایک باعث ہے، کیونکہ ہم دوسروں کے ساتھ جتنا زیادہ مشترک ہیں- یا جتنا زیادہ ہم آپس میں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں- ان کے لیے ہمدردی اتنی ہی زیادہ ہے۔سنہ 2019 کے ایک مطالعے سے پتہ چلا کہ جب سے ہمارے ارتقائی راستے مختلف ہوئے، ہماری اپنے پرانے شریکِ سفر جانوروں سے ہمدردی وقت کے ساتھ ساتھ کم ہوتی گئی۔

یہاں تک کہ سائنس دان زیادہ جاذب نظر ہم سے وابستہ جانوروں کا مطالعہ کرنے میں زیادہ متعصب ہیں۔سنہ 2010 کے ایک مطالعے سے پتہ چلا ہے کہ خطرے سے دوچار ایمفیبین (خشکی اور تری دونوں کا وہ جانور جو خشکی اور پانی دونوں میں رہے) کے بارے میں شائع ہونے والے ہر تحقیقی مقالے کے مطابق، دودھ دینے والے ایسے جانور جن کی نسل ختم ہوسکتی ہے ان کی تعداد 500 سے زیادہ تھی۔

معاشرے میں خوف اور اجنبیت کا یہ مرکب بنیادی طور پر مکڑیوں سے پیار کرنے کی ہماری صلاحیت کو روک سکتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے یہ عوامل انسانوں میں ان کے اقلیتی گروہوں کو پسماندہ بناتے ہیں۔مثال کے طور پر، ایک تجربے سے پتہ چلا کہ کسی کی خوفناک تصاویر کے سامنے لانے سے لوگوں میں اس کے لیے ہمدردی کا جذبہ کم ہوجاتا ہے۔

درحقیقت یہ ان تمام عوامل کا مجموعہ ہماری ہمدردی کو کم کرنے میں بہت موثر ثابت ہوتے ہے، یہ دشمن کے خلاف نفرت پھیلانے یا جنگ کے وقت پروپیگنڈے میں

'زینوفوبیا' کو بڑھانے کا ایک کلاسیکی طریقہ ہے۔ اور مکڑیوں کی تصویروں کو اکثر بیک وقت دونوں مقاصد حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جنگ عظیم دوئم کے ایک مشہور برطانوی پوسٹر میں ہٹلر کو ایک لمبی ٹرنگی مکڑی کی طرح لٹکتے ہوئے دکھایا گیا ہے جو دنیا میں گھوم رہی ہے، جس سے سنگین خطرہ ہے: 'ایک ایک کر کے اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی'۔

کنٹرول کا ختم ہونا

مکڑیوں کے بارے میں بہت ہی ڈراؤنی کہانیوں میں حیرت کا عنصر ہوتا ہے۔ جیسے کہ ایک دوست نے ہالووین کا ایک پرانا لباس پہنا جس کو کئی سالوں سے اونچی جگہ پر رکھا گیا تھا، اور کسی نے کہا 'واہ، مجھے آپ کی گردن پر مکڑی کی تصویر پسند ہے۔ یہ بہت ہی حقیقت پسندانہ ہے۔۔۔' بہت زیادہ چیخیں نکلنا شروع ہوئیں، کیونکہ یہ یقینی طور پر نظر کا حصہ نہیں تھا، بلکہ یہ ایک حقیقی مکڑی تھی جو آہستہ آہستہ خاموشی سے ان کی ٹوپی سے نیچے کی جانب سرک رہی تھی۔

لاک ووڈ وضاحت کرتا ہے کہ یہ مکڑیوں سے ہماری نفرت کا ایک بڑا عنصر ہے۔ ہمارے کنٹرول سے انحراف کرنے کی ان کی صلاحیت۔ 'ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی دنیا کے انچارج ہیں، لیکن مکڑیاں اور کیڑے آتے رہتے ہیں، وہ فرش بورڈز کے نیچے سے رینگتے رہتے ہیں اور کیا کچھ نہیں کرتے ہیں۔ اس لیے ہم میں ایک احساس رہتا ہے --- میرے خیال میں یہ ایک اچھا احساس ہے --- کہ ہم ان باتوں کے بارے میں کوئی خطرہ مول نہیں لیتے ہیں۔'

مکڑیاں چھپنے میں تیزی سے چھپنے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہیں۔ آوارہ کبوتروں یا لومڑیوں کے برعکس، آپ انہیں دور رکھنے کے لیے دیوار نہیں بنا سکتے۔ اگرچہ ہم اب انتہائی کنٹرول کی دنیا میں رہتے ہیں۔ جہاں ہم دنیا کے دوسری طرف سے حرارتی نظام کو آن کر سکتے ہیں۔ مکڑیاں اب بھی غیر متوقع طور پر ہمارے بستروں اور جوتوں میں ظاہر ہو سکتی ہیں، جیسا کہ وہ ہزاروں برسوں سے ظاہر ہو رہی ہیں۔ ہم اسے پسند کریں یا نہ کریں، ان کا گھروں سے خاتمہ ناممکن ہے۔

ایک خاموش چیخ

کچھ دیگر عملی قسم کی باتیں بھی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ مکڑیوں میں جذبات نہیں ہوتے جنھیں ہم آسانی سے پہچان سکیں، یا وہ اپنے بارے میں شور مچائیں۔ لہٰذا جب مکڑی کو تکلیف ہوتی ہے تو ہم غافل رہتے ہیں۔

لاک ووڈ کا کہنا ہے کہ 'یہ عجیب جگہ ہے جس پر وہ قابض ہیں۔ اگر وہ مکمل طور پر غیر متعلقہ ہوتے تو مجھے لگتا ہے کہ ہمارا ان کے ساتھ اس طرح کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔ لیکن ان کے حیوان ہونے کے بارے میں ہم میں ایک احساس موجود ہے --- ہم ایک سطح پر تو فوراً ان کی شناخت کرتے ہیں، لیکن پھر فوراً ایک دوسری سطح پر ان کے متعلق کچھ احساس بھی نہیں کرتے ہیں۔

جیسا کہ ماہرین ماحولیات اسٹیفن کیلرٹ نے اپنی کتاب (Kinship to Mastery: Biophilia In Human Evolution And Development) میں لکھا ہے کہ '۔۔۔شاید سب سے زیادہ پریشان کن، یہ مخلوق (کیڑے مکوڑے اور دیگر جڑواں جانور) ذہنی زندگی سے محروم دکھائی دیتے ہیں'۔ وہ وضاحت کرتا ہے کہ ہمارے نزدیک وہ (ہماری طرح) انسانی جذبات محسوس نہیں کر سکتے ہیں۔ گویا ان کے اپنے دماغ ان کے وجود سے متعلق نہیں ہیں۔ (یقیناً یہ ایک وہم ہے۔)

ان تمام باتوں کا مطلب یہ ہے کہ آپ یہ سوچے بغیر کہ اسے تکلیف ہو گی یا نہیں آپ مکڑی کو کچل سکتے ہیں۔ اور جب تک کہ آپ کا ہدف بھاگ نہ جائے یا آپ کا خوفناک کام ادھورا نہ رہ جائے، آپ میں احساس پیدا ہی نہیں ہوتا ہے کہ (اُسے کچلتے ہوئے) آپ کوئی ناخوشگوار کام کر رہے ہیں۔

تاہم یہ بات تب سچ ہے جب وہ بہت چھوٹی چھوٹی مکڑیاں ہوں۔ اور زیادہ تر لوگ بڑی بڑی مکڑیوں کو مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سڈنی یونیورسٹی کے فنکشنل جینومکس کے پروفیسر نیلی بڑے سائز کی مکڑیاں دکھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ 'یہاں ہمارے پاس شکاری مکڑیاں ہیں، جو کہ اس جیسی بڑے بڑے سائز کی ہوتی ہیں۔ لیکن یہاں لوگ انہیں نہیں مارتے ہیں، یہ ہماری دوست ہیں۔' گریگ نیلی سڈنی یونیورسٹی میں دوسرے جانوروں کے علاوہ پھلوں کی مکھیوں میں تکلیف کا مطالعہ کرتا ہے۔

لاک ووڈ اس سے اپنی بات جوڑ سکتا ہے۔ 'کچھ بہت بڑے لال بیگوں (کاکروچوں) کے بارے میں بھی یہی بات ہو سکتی ہے۔ میری بیوی عام طور پر کیڑوں سے نفرت کرتی تھی، لیکن وہ نہیں چاہتی تھی، اور میں دوسروں کو جانتا ہوں جو کاکروچ پر قدم رکھنا پسند کرتے ہیں کیونکہ وہ اس کے کچلنے کی ایک مخصوص آواز سننا پسند کرتے ہیں۔'

یہ بات وہ اپنے خیال کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے۔ کئی سال پہلے۔ جب وہ گھر پہنچا تو دیکھا کہ اس کی بیوی دہی کے برتنوں کے نیچے کیڑوں کو پکڑتی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ 'یہ ایک چھوٹی سی موت کی طرح تھا۔'

لاک ووڈ کا کہنا ہے کہ 'کسی دوسرے وجود کو کچلنے کے بارے میں کچھ بات ضرور ہے، تاہم اس وقت تک ہمیں یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں لگتا ہے جب تک ہمیں اس کے کچلے جانے کے وقت اس کے ردعمل کا کوئی حسی سگنل نہ مل جائے، جو یہ بتائے کہ یہ ایک حقیقی قتل ہے یا یہ ایک تشدد ہے۔'

ایک خوفناک چہرہ

اپنی خوفناک فینگوں اور دھمکانے والی ٹانگوں کے علاوہ مکڑیوں کو انسانی نقطہ نظر سے اپنی شکل و صورت کی وجہ سے ایک اور چیلنج کا سامنا کرنا پڑتا ہے: وہ انسانی بچوں کی طرح پیاری سی شکل نہیں رکھتے ہیں۔

'بیبی فیس ایفیکٹ' (بچوں والے چہرے کا اثر) انسانوں میں ایک بہت ہی بااثر پوشیدہ تعصب ہے، جس کا مطلب ہے کہ ہم اتفاقی طور پر لوگوں- اور جانوروں کے ساتھ - قدرتی طور پر 'نیوٹینس' یا بچوں جیسی خصوصیات کے ساتھ سلوک کرتے ہیں گویا کہ وہ اصل بچے ہیں۔مثال کے طور پر بڑی آنکھیں، بڑی پیشانی، چھوٹی ناک اور ٹھوڑی، اور فرشتہ شکل چھوٹے ہونٹ وغیرہ انسانوں میں ہمدردی اور پیار کے طاقتور جذبات کو متحرک کر سکتے ہیں۔

تاہم یہ اثر ہمیں اچھی طرح سے ثابت شدہ غلطیوں کی طرف لے جا سکتا ہے۔ماحولیاتی تحفظ میں، یہ اکثر مشاہدہ کیا گیا ہے کہ 'پیاری' نظر آنے والی انواع کو نمایاں طور پر زیادہ توجہ اور مالی اعانت ملتی ہے، جبکہ انسانوں کی دیکھ بھال میں 'بدصورت' جانور- ، مثال کے طور پر چڑیا گھروں اور لیبارٹریوں میں- ان کی زندگی کا معیار کم ہو سکتا ہے، کیونکہ ہم ان کی تکلیف اور ان کے دکھ کو سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔

اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے ساتھ مکڑیاں اس کیٹیگری میں شمار کی جاتی ہیں- ہمارے بندر جیسے دماغوں کے لیے مکڑوں کی شکل غیر معصومانہ لگتی ہے، جس سے ہم کم مہربان اور قابل اعتماد ہونے جیسی غیر معمولی خصوصیات کو منسوب کرتے ہیں۔

اس کے برعکس، مکڑی کی وہ انواع جن کی آنکھیں بڑی ہوتی ہیں عام طور پر کم خوفزدہ مخلوق کے طور پر دیکھی جاتی ہے۔

ایک مثال چھلانگ لگانے والی مکڑیوں کی ہے، جن کی دو اہم اضافی آنکھیں ہوتی ہیں، ان کی آنکھوں کے اضافی جوڑے ان کے سروں کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں۔وہ اتنی قابلِ پسند ہوتی ہیں کہ ایک مقالے کے محققین نے انہیں 'گیٹ وے مکڑیاں' قرار دیا- اس طرح یہ مکڑیاں اپنی بدصورت اقسام کی ایک لحاظ سے مفید نمائندہ سفیر بنتی ہیں۔وہ پہلے ہی متعدد وائرل ویڈیوز میں ظاہر ہو چکی ہیں، جنہوں نے کئی معروف گیتوں میں اپنے پیار کے ملاپ کا رقص کرتے دکھایا ہے۔

ایک ناقص درجہ بندی

اس سے قطع نظر کہ ہم مکڑیوں کو مضرِ صحت سمجھتے ہوئے تلف کرنا درست سمجھتے ہیں، ان کی زندگیوں کو زیادہ احترام کے ساتھ پیش کرنے کے لیے کافی دلائل موجود ہیں - اور ایسا کرنے میں ہماری مدد کرنے کے لیے نفسیاتی تدبیریں بھی موجود ہیں۔

ایک طریقہ یہ ہے کہ مکڑیوں کو انسانی رویوں کی حامل مخلوق بنا کر پیش کیا جائے تاکہ ہمارے ذہنوں میں ان کے لیے ایک قدرتی ہمدردی پیدا ہو سکے اور انسان ان مکڑیوں سے ایک میل جول بڑھائیں۔یہ وہ طریقہ ہے جو ختم ہونے کے خطرے سے دوچار انواع ومخلوقات کو بچانے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے (اتفاق سے مکڑیوں کی کئی اقسام اسی خطرے سے دوچار ہیں)۔یہ مقصد مکڑیوں کو زیادہ انسان جیسی جسمانی خصوصیات کے ساتھ دکھا کر حاصل کیا جا سکتا ہے، مثلاً ہم انہیں، انسانی جذبات اور جنس دے کر پیش کر سکتے ہیں- 'دیکھو، وہ غصے میں ہے!' - اور ان سے اختلافات کے بجائے ان سے اپنی مماثلتوں پر توجہ مرکوز کریں۔

تاہم ایک مخالف مکتبہ فکر بھی ہے: چونکہ ہمدردی میں بہت زیادہ خامی ہے، ہمیں اسے اپنے اخلاقی فیصلوں کی بنیاد کے طور پر استعمال کرنے سے گریز کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس کے بجائے، ہم مکڑی کی زندگیوں کو عقلی حساب کی بنیاد پر پیش کر سکتے ہیں- جیسے ماحولیاتی نظام میں ان کے کام کی اہمیت۔لہٰذا ہم اپنے آپ کو یہ یاد دلانے کی کوشش کر سکتے ہیں کہ مکڑیوں کی انواع ہر سال 40 سے 80 کروڑ ٹن حشرات کا شکار کرتی ہیں، اور ایسا کرنے سے بشمول انسانوں میں بیماری پیدا کرنے والے کچھ کیڑوں کے، یہ حشرات کی آبادی کو حد سے زیادہ پھیلنے سے روکنے میں مدد دیتے ہیں۔

ان تجاویز کے متبادل کے طور پر، ہم مکڑیوں کو ان کی صلاحیتوں اور حیاتیات کی وجہ سے ان کے تلف کرنے کے رجحان پر قابو پا سکتے ہیں- اپنے آپ کو ان کے دماغ کی زبردست ذہانت کے بارے میں آگاہ کریں جن کی وجہ سے یہ مکڑیاں قابل ذکر پیچیدہ فیصلہ سازی کی صلاحیت ظاہر کرتی ہیں حالانکہ وہ دودھ دینے والے جانوروں کی نسبت کئی ہزار گنا چھوٹی ہیں۔

لیکن ایک اور طریقہ بھی ہے۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کے علم حشرات الارض (انٹومولوجی) کے پروفیسر، جیرالڈین رائیٹ کہتی ہیں کہ 'مجھے لگتا ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی کی کچھ اقسام دوسری اقسام سے زیادہ قیمتی ہیں۔۔۔لیکن وہ ان کے بارے یکساں طور پر نہیں سوچتے ہیں۔وہ ان کے بارے سوال نہیں کرتے ہیں۔' وہ بتاتی ہیں کہ ہمارا مکڑیوں کو خاطر میں لانا مغربی تہذیب کی ایک خصوصیت ہے، کیونکہ کئی ثقافتوں اور مذاہب- جیسے بدھ مت- کا خیال ہے کہ تمام زندہ انواع ہزاروں برسوں کے لیے اہم ہیں۔

تاہم کچھ ماہرین پر امید ہیں کہ ہم آہستہ آہستہ مکڑیاں اور کیڑے مکوڑے قبول کر رہے ہیں- خاص طور پر جب لوگ حیاتیاتی تنوع (بائیو ڈائیورسٹی) اور ماحولیاتی تحفظ کے بارے میں مزید سوچنا شروع کر رہے ہیں۔کیمبرج یونیورسٹی میں جانوروں کی فلاح و بہبود کے پروفیسر ڈونلڈ بروم کا کہنا ہے کہ 'دوسری تبدیلی یہ خیال ہے کہ ہر نوع کی ایک اپنی اہمیت ہے، اور آپ کو صرف اس لیے تلف نہیں کرنا چاہیے کیونکہ آپ اسے یونہی تلف کرنا چاہتے ہیں۔'

جیسے ہی میں یہ آرٹیکل لکھ رہی تھی، میں نے اپنے باغ میں ایک نئی دھاری دار مکڑیوں کو بلند ہوتے دیکھا- شاید یہ میری پرانی دوست مکڑی کی اولاد میں سے ایک ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ میں انہیں ان کے حال پر چھوڑ دوں گی، چاہے میں انہیں پسند کروں یا نہ کروں۔

❋❋❋

کینیڈا میں بچوں کی اجتماعی قبروں کے ملنے کے پیچھے چھپی ہولناک تاریخ

امریکہ نے جس طرح افغانستان سے اپنا فوجی انخلا کیا اس پر اس کی ساری دنیا میں جگ ہنسائی ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امریکہ کے عوامی نمائندوں نے اس پر بہت شور اُٹھایا اور اس واقعے کی تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ نتیجتاً امریکی کانگریس میں امریکی حکومتی عہدیداروں کی پیشیاں ہوئیں جن میں امریکی وزیر دفاع، وزیرِ خارجہ، اور امریکی افواج کے اعلیٰ عہدے پر فائز جرنیل حضرات شامل ہیں۔ اس سماعت کو "Afghanistan 2001-2021: Evaluating the withdrawal and U.S. Policies" کا نام دیا گیا۔ جہاں امریکہ میں افغانستان سے انخلا کے متعلق کاروائی چل رہی ہے وہیں کینیڈا میں 30 ستمبر پہلی دفعہ Truth and Reconciliation کے دن کے طور پر منایا گیا۔ ایسا کیوں کیا جارہا ہے اس پر کینیڈا کی مشہور صحافی فرح ناصر نے ایک مختصر دستاویزی پروگرام تیار کیا ہے جس میں مندرجہ ذیل معلومات دی گئیں ہیں۔

رہائشی سکولوں کی ہولناکیوں سے پردہ اٹھتا جارہا ہے۔ یہ کینیڈا کی تاریخ کا ایک چونکا دینے والا اور ہولناک حصہ ہے اور حیران کن بات یہ ہے کہ ہم ان اسکولوں کے اندرونی واقعے کے بارے میں کتنا کم جانتے تھے۔ حال ہی میں آپ نے رہائشی اسکول کے بارے میں بہت کچھ سنا ہو گا، لیکن کئی دہائیوں تک اس پر خاموشی تھی! ہزاروں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا گیا، زیادتی کی گئی اور کچھ معاملات میں وہ مر بھی گئے۔ یہ اسکول باعثِ شرم اور مختلف نسلوں کے لئے صدمے کا ذریعہ تھے۔ یہ رہائشی سکولوں کی کہانی ہے جو اب کینیڈا میں پوری طرح آشکار ہے۔ رہائشی اسکولوں کی اصطلاح سے مراد ایک وسیع مذہبی سکول سسٹم ہے جو کینیڈا کی حکومت نے قائم کیا تھا اور گرجا گھروں کے زیر اہتمام اسکولوں کو 1867 میں برٹش نارتھ امریکہ ایکٹ کی منظوری اور پھر 1876 میں انڈین ایکٹ کے نفاذ کے ساتھ مُقامی بچوں کو تعلیم دینے اور انہیں یورو کینیڈا کی ثقافت میں شامل کرنے کے مقصد کے تحت قائم کیا گیا تھا۔ کینیڈا میں بسنے والے یورپی باشندوں نے یہ غلط رائے قائم کی کہ یورپی نسل سے تعلق رکھنے والے (ریڈ) انڈینز سے برتر تھے۔ انہوں نے مقامی لوگوں کو جاہل، وحشی اور رہنمائی کے قابل کے طور پر دیکھا اور محسوس کیا کہ انہیں ان کو مہذب بنانے کی ضرورت ہے، یہ خیال کیا گیا کہ (ریڈ) انڈینز بچوں کو عیسائیت اپنانے اور فرانسیسی یا انگریزی سکھا کے مہذب انسان بنایا جاسکتا ہے۔ یہ کوششیں 17 ویں صدی کے اوائل میں شروع ہوئیں جب فرانسیسی نوآبادیات نیوفرانس پہنچے جس میں بہت سے صوبے شامل ہیں جو اب کینیڈا کا حصہ ہیں۔

پہلا رہائشی سکول دی موہاک انسٹی ٹیوٹ 1831 میں کھولا گیا۔ یہ برینٹ فورڈ، اونٹاریو میں تھا۔ آخری اسکول 1996 میں بند ہوا، یعنی یہ بہت زیادہ پُرانی بات نہیں ہے۔ کینیڈا میں 1831 اور 1996 کے درمیان 130 سے زائد رہائشی اسکول کام کر رہے ہیں۔ 1931 میں کینیڈا میں 80 رہائشی اسکول کام کر رہے تھے اور یہ ایک وقت میں اُن اسکولوں کی سب سے زیادہ تعداد تھی اور یہ مختلف گرجا گھروں کے زیرِ اہتمام چلائے گئے جن میں رومن کیتھولک، اینگلیکن، یونائیٹڈ اور پراسپیٹیریا شامل ہیں۔ فرسٹ نیشن میٹیئن، انوئیٹ کے بچّوں کو اُن کی مرضی کے خلاف ان کے خاندانوں اور برادریوں سے زیادہ ہٹایا گیا اور اُنھیں اسکولوں میں اپنی روایات، ثقافتی طریقوں اور زبان کو ترک کرنے پر مجبور کیا گیا۔ بچوں کو نئی شکل میں ڈھالنے کی کوششیں اس وقت شروع ہوتی جب وہ اسکول پہنچتے طلباء کے بال کاٹے گئے، ان سے ان کے روایتی کپڑے چھین لیے گئے، انہیں یونیفارم پہننے پر مجبور کیا گیا، اکثر انہیں نیا نام دیا جاتا بعض اوقات انہیں صرف ایک نمبر دیا جاتا تھا۔ رہائشی سکولوں کے طلباء وطالبات نے وہی تعلیم حاصل نہیں کی جیسی پبلک سکول سسٹم میں تھی اور اُن سکولوں کو فنڈز کی شدید کمی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ رہائشی اسکولوں کے سابق طلباء نے سکول کے عملے کی جانب سے کی جانے والی خوفناک زیادتی کے بارے میں بات کی۔ دائمی جسمانی، جنسی، اور نفسیاتی اور جذباتی زیادتی جس کا آپ تصور کرسکتے ہیں کہ اُن کے اثرات زندگی بھر رہتے ہیں۔

اُن اسکولوں کے سابق طلبہ مارپیٹ کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ کچھ طالب علموں کو ان کے بستروں سے جکڑا گیا۔ کچھ کو اپنی مادری زبانیں بولنے پر سزا کے طور پر ان کی زبانوں میں سوئیاں چبھوئی گئیں۔ ان زیادتیوں کے ساتھ ساتھ اسکولوں میں طلباء کی زیادہ تعداد، ناقص صفائی ستھرائی اور شدید ناکافی خوراک اور صحت کی عدم دیکھ بھال کے باعث ہلاکتوں کی تعداد حیران کن حد تک بڑھ گئی۔ بہت سے بچے تپ دق اور انفلوئنزا کا شکار تھے، کچھ خودکشی سے مرجاتے تھے، کچھ غذائی قلت سے مرجاتے تھے۔

ایک اندازے کے مطابق 150000 بچوں نے سکولوں میں تعلیم حاصل کی اور اندازہ لگایا گیا کہ ان میں 3000 سے 6000 بچے مر گئے۔ کئی سالوں تک طلباء اور والدین نے سکولوں کے اندرونی حالات پر احتجاج کیا۔ کچھ بچے تعاون کرنے سے انکار کرتے تھے، کچھ نے کھانا چرالیا، دوسرے بھاگ گئے، کچھ نے احتجاج میں آگ لگائی لیکن ان کی فریاد کو زیادہ تر نظر انداز کیا گیا۔ 1940 کی دہائی تک حکومت پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ یہ اسکول غیر موثر تھے اور 1969 میں انڈین امور کے محکمہ نے چرچ کی شمولیت کو ختم کرتے ہوئے اسکول کا نظام سنبھال لیا۔ اور پھر مقامی کمیونٹیز اگلے چند دہائیوں تک ان تجربات سے متاثر ہونے والے طلباء کی مدد کے مشکل کام کو انجام دیتی رہیں۔ 1990 کی دہائی میں ان اسکولوں کے سابق طلباء نے حکومت اور چرچ سے مطالبہ کیا کہ وہ سکولوں میں ان کے ساتھ کی گئیں زیادتی کو تسلیم کریں اور ان کے دکھوں کا معاوضہ فراہم کریں۔ 2005 میں وفاقی حکومت نے بدسلوکی سے بچ جانے والوں کے لیے 1.9 ارب ڈالر کے معاوضہ کا اعلان کیا۔

2007 میں وفاقی حکومت اور وہ گرجا گھر جنہوں نے سکول کا انتظام کیا تھا، سابقہ طلباء کو رہائشی سکول سیٹلمنٹ معاہدے کے تحت مالی معاوضہ فراہم کرنے پر رضامند ہوئے۔ 1 جون 2008 کو اس وقت کے وزیراعظم اسٹیفن ہارپر نے کینیڈا کی حکومت کی جانب سے کینیڈا کے رہائشی سکولوں کے تمام طلباء سے رسمی طور پر معذرت کی۔

اس معافی نے اسکولوں کے مقامی ثقافت پر گہرے نقصان دہ اور دیرپا اثرات کو تسلیم کیا اور یہ کینیڈا میں مقامی لوگوں کے ساتھ نئے تعلقات قائم کرنے کے اقدامات میں سے ایک تھا لیکن اس میں نیو فاؤنڈلینڈ اور لیبراڈور میں رہائشی اسکولوں کے بچ جانے والوں کو شامل نہیں کیا گیا کیونکہ ان صوبوں میں جب رہائشی اسکول شروع ہونے پر یہ کینیڈا کا حصہ نہیں تھے۔ چنانچہ وہاں زندہ بچ جانے والوں نے کلاس ایکشن مقدمہ شروع کیا اور 59 ملین ڈالر کا تصفیہ 10 مئی 2016 کو ہوا۔ 24 نومبر 2017 کو وزیراعظم جسٹن ٹروڈو نے باضابطہ طور پر نیوفاؤنڈلینڈ اور لیبراڈور کے رہائشی اسکولوں کے بچ جانے والے طلباء سے معذرت کی۔ ماضی کی غلطیوں کو دور کرنے کے اپنے عزم کے ایک حصے کے طور پر حکومت نے رہائشی اسکولوں کی تاریخ اور دیرپا اثرات کی دستاویز کے لیے سچائی اور مصالحت (Truth and Reconciliation) کمیشن بھی قائم کیا۔

2015 میں سچائی اور مصالحتی کمیشن کی رپورٹ جاری کی گئی۔ اس کمیشن نے ان اسکولوں کی بہت ہولناک تصویر کھینچی اور اس عمل کو کینیڈا کے مقامی لوگوں کی ثقافتی نسل کشی قرار دیا ہے۔ اس نے مصالحت کو فروغ دینے کے لیے کارروائی کرنے کے لیے 94 نکات پیش کیے۔ رہائشی سکولوں کے بارے میں طلباء کو تعلیم دینا شروع کرنا اہم سفارشات میں سے ایک ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ طلباء بالآخر کینیڈا کی تاریخ کے اس اہم حصے کے بارے میں سیکھ رہے ہیں۔ اگرچہ کینیڈا اپنی تنوع (diversity) اور مختلف قومیتوں کو قبول کرنے پر فخر کرتا ہے، یہ اس کے تاریک ماضی سے واضح ہے کہ ہمیشہ ایسا نہیں تھا۔ حالانکہ رہائشی اسکولوں کے دروازے بند ہو چکے ہیں لیکن ان کے لگائے ہوئے زخم ابھی تک کھلے اور تکلیف دہ ہیں اور یہ معلوم نہیں کہ یہ زخم کبھی بھریں گے یا نہیں۔ میں فرح ناصر ہوں اور یہ رہائشی سکولوں کی کہانی ہے، یہ کینیڈا ہے۔

یہ دو مثالیں ہیں کہ کس طرح دو قومیں اپنا محاسبہ کر رہی ہیں۔ قومیں اس طرح اپنی غلطیوں سے سیکھتی ہیں اور اپنا مستقبل بہتر بناتی ہیں۔ ان دو مثالوں کو اگر پاکستان کے حوالے سے دیکھا جائے تو پاکستان کی ستر سال سے زیادہ کی تاریخ میں مختلف اندوہناک واقعات رُونما ہوئے ہیں۔ اُن میں سے کچھ واقعات پر کمیشن بھی بنائے گئے ہیں اور اسمبلیوں میں بھی اُن پر سوال جواب کی نشستیں ہوئیں ہے۔ لیکن ناہی کبھی اُن کمیشنوں کی رپورٹ منظر عام پر آئیں ہے ناہی اسمبلیوں کی کاروائی عوام کے سامنے ہوئی ہے۔ ناہی اِن واقعات کے بارے میں طلبہ کو اسکولوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ آج پاکستان میں مختلف قومیتوں، فرقوں اور نسلوں کے لوگ ایک دوسرے سے متنفر ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی تاریخ کے تاریک پہلوؤں سے آنکھیں چُرانے کی بجائے آپس میں اُن پر گفتگو اور مکالمہ کریں۔

❁❁❁

بچوں کا گلستان

بچوں میں حسِ مزاح ان کی ذہانت کا اظہار ہے

استنبول: بچوں میں حسِ مزاح ان میں بلند آئی کیو اور ذہانت کو ظاہر کرتی ہے، اب ایک سروے سے معلوم ہوا ہے کہ بہتر معلومات اور زبانی دلائل کے ماہر بچوں کی فطرت میں ہنسی مذاق کی حس پائی جاتی ہے۔ اس ضمن میں ایک مطالعہ ترکی میں کیا گیا جس کی تفصیلات ہیومر نامی تحقیقی جرنل میں شائع ہوئی ہیں۔ رپورٹ کے مطابق بالغان کے مقابلے میں کمرہ جماعت کے مسخرے بچے ہی درحقیقت ذہین ہوتے ہیں اور یوں بچوں میں ذہانت اور حسِ مزاح کا گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ انسانی تاریخ میں حسِ مزاح کو بلند ذہانت قرار دیا جاتا رہا ہے کیونکہ برجستہ جملوں کا اظہار ہوشیاری اور حاضر دماغی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سے قبل بڑوں میں اسی طرح کی تحقیق ہوئی ہے لیکن اب پہلی مرتبہ بچوں پر اس کے اثرات معلوم کیے گئے ہیں۔ اس ضمن میں 200 بچوں میں سے ہر ایک کو دس کارڈ دیئے گئے جن میں کارٹون بنائے گئے تھے۔ تمام بچوں سے کہا گیا کہ وہ اسے دیکھتے ہوئے کوئی مضحکہ خیز جملہ یا عنوان لکھیں۔ اس کے بعد سات مختلف ماہرین نے ان جملوں کی درجہ بندی کرتے ہوئے تحریر شدہ موضوع کو اول، دوم، سوم اور دیگر درجات دیئے۔ اس کے بعد تمام بچوں کے معیاری آئی کیو ٹیسٹ بھی لیے گئے۔ جب بچوں میں ذہانت اور حسِ مزاح کا جائزہ لیا گیا تو پتا چلا کہ جن بچوں کی حسِ مزاح بلند تھی ان میں ذہانت کا معیار بھی اونچا تھا۔ 68 فیصد بچوں میں ذہانت اور حسِ مزاح کا واضح تعلق سامنے آیا۔ بالخصوص جو بچے معلوماتِ عامہ یعنی جنرل نالج اور زبانی دلائل (وربل ریزننگ) کی صلاحیت بلند تھی ان میں مزاح کا عنصر اتنا ہی زیادہ تھا۔ تاہم ترک ماہرین کا خیال ہے کہ حسِ مزاح کی تعریف ہر معاشرے میں مختلف ہوتی ہے۔ ایک خطے کے لطیفے دوسرے علاقے کے لوگوں کے لیے نہیں ہو سکتے۔ اس کی وجہ ہے کہ حسِ مزاح کا تعلق معاشرے، رسوم اور اقدار پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے مطالعے مغربی ممالک میں ہوتے رہے ہیں لیکن اب ترکی میں یہ تحقیق ہوئی ہے جو مشرق اور مغرب کا سنگم ہے۔ اناطولو یونیورسٹی کے پروفیسر یوغور سائنک اس کے مرکزی نگراں ہیں جو کہتے ہیں کہ حسِ مزاح سے بچے بڑوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ اس کا ذہانت سے گہرا تعلق بھی ہے۔

❁❁❁

”آئی برو تھریڈنگ“
آنکھوں کی خوبصورتی بڑھائے

تحریر: رابعہ شیخ

لڑکیاں جب پہلی بار آئی برو تھریڈنگ کرواتی ہیں تو تھریڈنگ سے قبل انھیں ایک خوف سا محسوس ہوتا ہے لیکن اس کے بعد آنکھوں کی دلکشی میں اضافہ ہوتا دیکھ کر آئی برو تھریڈنگ کروانا ان کی ماہانہ روٹین کا حصہ بن جاتا ہے۔ آپ بھی آئی برو تھریڈنگ کے لیے باقاعدگی سے پارلر ضرور جاتی ہوں گی کیوں کہ خوبصورت بھنویں حسین اور دلکش آنکھوں کی ضامن ہوتی ہیں۔ خوبصورتی کے ساتھ بنی گھنی اور گہرے رنگ کی بھنویں چہرے کو جاذب نظر بناتی ہیں۔

بھنویں مختلف طریقوں سے بنائی جاسکتی ہیں مثلاً تھریڈنگ، ویکسنگ، ٹوئیزنگ (چمٹی نما ٹول کی مدد سے بالوں کے کھینچنے کے عمل کو ٹوئیزنگ کہتے ہیں) یا پھر مشین کے ذریعے۔ لیکن بھنویں بنانے کا سب سے آسان عمل تھریڈنگ ہی ہے، جسے ہر دور میں خواتین اپناتی ہیں۔ تھریڈنگ چہرے سے غیر ضروری بال ہٹانے کے عمل کو کہتے ہیں مثلاً بھنویں، اپر لپ، فورہیڈ وغیرہ پر موجود بال۔ آئی برو تھریڈنگ کا طریقہ یہ ہے کہ آپ دھاگے کو بل دے کر آئی برو کے اضافی بالوں کو اس کے درمیان میں رکھ کر انھیں جڑ سے اُکھاڑ لیں۔ یہی نہیں، بیوٹیشن بھی خواتین کو آئی برو بنانے کے لیے تھریڈنگ کا ہی مشورہ دیتی ہیں۔

آئی برو شیپ کا انتخاب؟

ٹرینڈ کے پیش نظر تو آج کل گھنی اور موٹی بھنوؤں کا فیشن خاصا ان ہے۔ لیکن بیوٹی ایکسپرٹ کی رائے کے مطابق آئی برو ہمیشہ آنکھوں کی یا چہرہ بناوٹ کے مطابق ہوں تو زیادہ مناسب ہے، کیونکہ پلکوں اور آئی برو کے درمیان خاصہ خلا موجود ہوتا ہے۔ اگر آپ بھی اس سلسلے میں پریشان ہیں کہ کون سا آئی برو شیپ آپ کی آنکھوں کے لیے بہترین ہے تو اس سلسلے میں ایکسپرٹ کہتے ہیں کہ اگر آپ کی وہ ہڈی، جس پر آئی برو موجود ہوتی ہیں، بہت باریک ہے تو اس پر قدرے موٹی آئی برو موزوں رہیں گی۔ اگر آپ اس سے غیر مطمئن ہیں تو آئی برو کے نیچے موجود چند ایک بل نکال دیجئے، اس میں کوئی مزائقہ نہیں ہے۔

یہی نہیں، آپ آئی برو پنسل اور تکنیک کے ذریعے بھی اپنی پسند کا شیپ حاصل کرسکتی ہیں۔ گھنی آئی برو کی خواہش مند خواتین اکثر آئی برو پنسل سے آئی برو کو موٹا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

اسی طرح اکثر ایکسپرٹ چہرے کی ساخت کے مطابق بھی آئی برو کے انتخاب کا مشورہ دیتے ہیں مثلاً

☆ بیضوی چہرے والی خواتین کے لیے کرو (curve) کے بجائے راؤنڈ شیپ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

☆ گول چہرے والی خواتین کے لیے ایکسپرٹ تیر کی کمان کی مانند آئی برو شیپ بنانے سے منع کرتی نظر آتی ہیں، ان کے لیے پرفیکٹ شیپ آئی برو کے عین درمیان میں واضح موڑ یا گھماؤ کا ہے۔

☆ لمبے چہرے والی خواتین کی بھنوں کے لیے فلیٹ شیپ بہترین ہے، اس سے چہرہ کم لمبا اور تھوڑا بیضوی محسوس ہوتا ہے۔

آئی برو تھریڈنگ میں احتیاط

اس کے فوائد پر بات کریں تو مندرجہ ذیل باتیں اہم ہیں۔

☆ نفاست سے بنی ہوئی آئی برو شیپ آنکھوں کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیتی ہے۔

☆ آئی برو کو زیادہ نیچے تک سنوارنے سے چہرہ رعب دار لگتا ہے۔

☆ کانوں کی طرف زیادہ اونچی آئی برو رکھنے سے چہرے پر حیرت کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔

آئی برو تھریڈنگ کے لیے بہت زیادہ مہارت اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے ہمیشہ کسی ماہر بیوٹیشن سے آئی برو تھریڈنگ کروائیں۔ اگر ایک بال بھی غلط نکل جائے تو شیپ خراب ہوجاتی ہے، کوشش کریں کہ بھنویں زیادہ باریک نہ ہوں۔ خواتین بھنوں کو سیدھا کرنے کے لئے برش استعمال کرتی ہیں لیکن وہ برش اتنی زور سے پھیرتی ہیں کہ اس سے بال ٹوٹ جاتے ہیں۔ کچھ چہرے بے انتہا سادہ ہوتے ہیں جبکہ بعض انتہائی کمپلیکس نقوش رکھتے ہیں۔ کمان دار آنکھوں کی بناوٹ سے مطابقت رکھتی ہوئی بھنویں خوبصورت لگتی ہیں۔

بھنویں کیسے گھنی کی جائیں؟

بھنویں گھنی کرنے کے لیے خواتین مختلف گھریلو ٹوٹکوں پر عمل کرتی ہیں، آج ہم بھی آپ سے کچھ ایسے ٹوٹکے شیئر کرنے جا رہے ہیں، جن سے ممکنہ طور پر آپ کی بھنویں گھنی ہوسکتی ہیں۔

☆ ہیئر اسٹائلسٹ بال لمبے کرنے کے لیے ناریل کا تیل لگانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ آپ اس تیل کو بھنویں گھنی کرنے کے لیے بھی استعمال کرسکتی ہیں۔ ناریل کے تیل کو ہلکا گرم کر کے اسے بھنوں پر لگائیں اور اسے رات بھر لگا رہنے دیں۔

☆ ایک روئی کا ٹکڑا لیں، اسے پیاز کے عرق میں بھگوئیں اور بھنوں پر لگا کر پندرہ سے بیس منٹ تک کے لیے چھوڑ دیں۔ پھر ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔ ایسا کرنے سے بھی بھنویں گھنی ہوں گی۔

❁❁❁

DANISH HOMES.ca

THE # 1 RESOURCE TO SELL & BUY PROPERTY

647 400 1700

Canada's

PREMIUM HOME SELLING SYSTEM

WE OFFER:

1 - Priority Access to buy a Pre-Construction Condo or House anywhere in Canada
2 - Deal with all top Lenders of Canada to arrange Financing
3 - Property Management and Lease arrangement
4 - Arrangement of Legal advise to buy or sell Property
5 - Construction and Development of Your Dream Home

DANISH CHAUDHRY

Direct: 647 400 1700 / Team: 647 723 9900

ZINGMAAR
EASY TO FOLLOW
UNIQUE RECIPES FROM
AROUND THE WORLD
FOLLOW @ZINGMAAR

ISSUE
NOVEMBER 2021
Vol-3 | Issue-3
RABI-UL-AWWAL
RABI-U-SSANI

AABGEENEI

MONTHLY KHAWATEEN DIGEST

An Educational and Literary Magazine For Social and Religious affairs

Under the supervision of
ABBASI ACADEMY

Editor
Mudessera Abbasi

Incharge of Gosha Adab
Humaira Nighat

Incharge of Bacchon Ka Gulistan / Pakwan
Eeshatur-Razia Abbasi

Chief executive Mohiuddin Abbasi

Printed from London

www.aabgeenei.com